جلد ۷۷ . جولائی ۱۹۷۲ء عدد ۵

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

ابوالاعلیٰ مودودی

ادارۂ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

ضروری اِعلان

تفہیم القرآن جلد اوّل تا جلد پنجم (مکمّل سیٹ) ہدیہ -/۴۰ روپے

خاص سیٹ (نفیس اور مضبوط ریگزین کی جلد) ہدیہ -/۱۵۰ روپے

ڈاک خرچ بذمّہ ادارہ

تاجر حضرات کے لیے کمیشن کی خصوصی پیش کش

تاجر حضرات کے نام اور مکمّل پتے

ماہنامہ "ترجمان القرآن" اور دیگر رسائل میں شائع کیے جائیں گے

نوٹ: مزید معلومات کے لیے اِدارہ سے رجوع فرمائیے

مینجر

فون نمبر: ۵۲۵۰۷

اِدارۂ ترجمان القرآن، اچھرہ لاہور

ترجمان القرآن، لاہور

فہرست مضامین

عدد ۵	جولائی ۱۹۷۲ء - جمادی الاوّل ۱۳۹۲ھ	جلد ۷۷

ماہنامہ ترجمان القرآن

۵-اے - ذیلدار پارک، اچھرہ - لاہور

چندہ سالانہ: آٹھ روپے - فی پرچہ: ۸۰ پیسے

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن، اچھرہ لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

طوفان خواہ کتنے ہی تباہ کن ہوں ان کی ابتدا چند ہلکے پھلکے جھونکوں سے ہوتی ہے اور چند تنکوں سے اُن کے رُخ کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ یہی حال کسی ملک میں سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی طوفانوں کا ہوتا ہے۔ اُن کی ابتدا بھی چند چھوٹے چھوٹے واقعات بلکہ حادثات سے ہوتی ہے اور عوام کے ذہنوں میں اُن کی وجہ سے جو ارتعاش پیدا ہوتا ہے اس سے اُن کے مزاج اور نوعیت کا بڑی آسانی کے ساتھ اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے اس ملک کی سیاسی فضا میں ایک خاص ترتیب کے ساتھ ایسے بگولے اُٹھ رہے ہیں بلکہ اٹھاتے جارہے ہیں جو کسی خوفناک طوفان کا پتہ دیتے ہیں۔ قتل و غارت کے اِکّا دُکّا واقعات بھی اگرچہ کسی مُہذب معاشرے کی اخلاقی صحت کی بربادی کی علامت ہوتے ہیں لیکن جب قتل و غارت معاشرتی زندگی کا معمول بن جائے بلکہ سیاسی وجوہ کی بنا پر شرفا قتل ہونے لگیں تو سمجھ لیجیے کہ ملک اب طوفان کی عین زد میں ہے۔

جماعتِ اسلامی کے معروف رہنما اور انتہائی بے لوث خادمِ خلق انسان جناب ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کا قتل کسی ایک فرد کا قتل نہیں بلکہ اخلاق و شرافت کا قتل، انسانی ہمدردی اور دلسوزی کا خون اور حق گوئی بیباکی پر کمینہ وار اور باطل کے مقابلے میں استقامت و عزیمت کی درخشندہ روایت پر شرمناک حملہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے مقدس خون سے ظالموں نے اس لیے ہاتھ نہیں رنگے کہ اُن سے اُن کو کوئی ذاتی پرخاش تھی یا اللہ کے اس پاکباز بندے نے اُن کی جائداد پر یا دولت پر قبضہ کر رکھا تھا بلکہ یہ درندہ صفت انسان صرف اس لیے اس مردِ حق آگاہ کی زندگی کا چراغ گل کرنے کے درپے تھے کہ وہ لوگوں کو یہ کہتا تھا کہ "جھوٹے خداؤں کی بندگی کو چھوڑ کر معبودِ حقیقی کی بندگی اختیار کرو"۔ اِس ایک

"جرم" کے علاوہ اس کا کوئی دوسرا جرم نہ تھا اور اسی جرم کی پاداش میں اس ملک کے ہر آمر نے اس کی زبان بندی کے لیے کئی جتن کیے، مختلف طریقوں سے اُسے ستایا۔ اس کی نقل و حرکت پر پابندیاں عائد کیں۔ حتیٰ کہ اُسے ایک مرتبہ نہیں بلکہ متعدد مرتبہ قید و بند کی صعوبتوں میں مبتلا کیا تاکہ وہ اپنے اس "جرم" سے باز آجائے، لیکن حق کے اس مسافر نے ان مصائب و شدائد کو پرکاہ کے برابر بھی نہ سمجھا اور حق و صداقت کی راہ پر بڑی پامردی سے گامزن رہا، یہاں تک کہ دشمن کے لیے اس ملک میں اس کا وجود ناقابلِ برداشت ہو گیا اور اس نے اس امر کا فیصلہ کر لیا کہ وہ حق پرست جسے نہ تو ظلم و استبداد ڈرا سکتا ہے نہ کسی دنیوی مفاد کا لالچ اسے خرید سکتا ہے، اُسے ہمیشہ کے لیے خاموش کر دینے کی ایک ہی صورت ہے کہ اُسے گولی سے ٹھنڈا کر دیا جائے۔ چنانچہ یہی ہوا اور اسلام کا یہ بطلِ جلیل خدا کے دین کا علم بلند کرتا ہوا شہید کر دیا گیا۔ ایک مسلمان کے لیے اس سے بڑی سعادت اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ وہ اعلائے کلمۃ الحق کی خاطر اپنی جان آفریں کے حوالے کر دے اور خدا وند تعالیٰ کے حضور میں اپنے خون کا نذرانہ پیش کرتے ہوئے ادب و انکسار سے کہے ؎

جان دی، دی ہوئی اُسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

ڈاکٹر صاحب مرحوم دین و دنیا دونوں میں فائز المرام ہیں۔ وہ بڑے خوش نصیب ہیں کہ انہوں نے اپنا گوہرِ مقصود پا لیا ہے۔ البتہ جن لوگوں کو وہ اپنے پیچھے چھوڑ گئے ہیں اُن کے لیے یہ صدمہ جانکاہ ہے۔ اُن کی وفات سے اُن کے بیوی بچوں پر جو افتاد پڑی ہے وہ بڑی المناک ہے۔ اُن کے عزیز و اقارب اور دوست و احباب کے دل جس طرح اُن کی جدائی سے زخمی ہوئے ہیں اُسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ زخموں کی اس ٹیس کو وہ خود ہی محسوس کرتے ہیں اور قحط الرجال کے اس دور میں جماعت اسلامی اپنے ایک بہترین کارکن کی خدمات سے جس طرح محروم ہوئی ہے اُس کا اندازہ اُن دردبھرے الفاظ سے لگایا جا سکتا ہے جو امیر جماعت اسلامی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے ان کی شہادت پر ارشاد فرمائے۔ یہ صدمات، نقصانات اور محرومیاں اپنی جگہ بڑی ہی تکلیف دہ ہیں اور ان کی تلافی کی بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آتی الا یہ کہ قادرِ مطلق غائب سے

کوئی سامان کر دے، لیکن ان سب سے بڑھ کر تکلیف دہ بلکہ تشویشناک چیز جس کی طرف مولانا نے اشارہ کیا ہے وہ ملک کا انتہائی مخدوش مستقبل ہے۔ وہ کوتاہ بین لوگ جنہوں نے یہ سنگین جرم اس زعمِ باطل میں گرفتار ہو کر کیا ہے کہ اگر انہوں نے ڈاکٹر صاحب کو خون کی رنگین چادر میں ایک مرتبہ ڈھانپ کر عوام کی نظروں سے اوجھل کر دیا ہے تو پھر وہ ہمیشہ کے لیے اس "خطرے" سے محفوظ ہو جائیں گے انہیں جلد ہی اپنی کوتاہ نظری کا احساس ہو جائے گا۔ ان سے پہلے بھی عقل کے اندھوں نے اس غلط فہمی میں مبتلا ہو کر اپنی نظر میں "ناپسندیدہ عناصر" کو خون کی چادر میں لپیٹ کر اپنی راہ سے ہٹانے کی کوشش کی لیکن "انہیں جلد ہی یہ معلوم ہو گیا کہ اُن کا یہ ظالمانہ حربہ نتائج کے اعتبار سے سخت ناکام ہے اور اس نے اُن کے لیے نہایت سنگین مسائل پیدا کر دیے ہیں۔ خونِ ناحق کے ہر قطرے سے لاتعداد "ناپسندیدہ عناصر" نے جنم لیا اور جن کے ہاتھ سے اپنے تخت و تاج کو محفوظ کرنے کے لیے اُن عاقبت نااندیشوں نے خون کی ہولی کھیلی تھی وہی ہاتھ بالآخر ان کی بربادی کا سبب بنے۔

شرک کے بعد قتلِ ناحق سے زیادہ خدا کے نزدیک کوئی دوسرا جرم نہیں۔ چنانچہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَالَّذِينَ لَا يَدْعُونَ مَعَ اللَّهِ إِلَٰهًا آخَرَ وَلَا يَقْتُلُونَ النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ ۔ (الفرقان - ۶۸)

وہ لوگ جو اللہ کے سوا کسی اور معبود کو نہیں پکارتے اللہ کی حرام کی ہوئی کسی جان کو ناحق ہلاک نہیں کرتے۔

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا ط وَمَنْ أَحْيَاهَا فَكَأَنَّمَا أَحْيَا النَّاسَ جَمِيعًا ط (المائدہ - ۳۲)

جس نے کسی انسان کو خون کے بدلے یا زمین میں فساد پھیلانے کے سوا کسی اور وجہ سے قتل کیا اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر دیا اور جس نے کسی کو زندگی بخشی، اس نے گویا تمام انسانوں کو زندگی بخش دی

دنیا میں نوعِ انسانی کی زندگی کا بقا اس بات پر منحصر ہے کہ ہر انسان کے دل میں دوسرے انسانوں کی جان و مال کا احترام موجود ہو اور ہر ایک دوسرے کی زندگی کے بقا اور تحفظ میں مددگار بننے کا جذبۂ صادق رکھتا ہو۔ جو شخص یا گروہ ناحق کسی کی جان لیتا ہے وہ انسانیت کے اس شیریں عنصر سے محروم

ہوتا ہے جس کی بنا پر وہ دوسرے انسانوں کی زندگی کا تحفظ چاہتا ہے۔ وہ صرف ایک فرد یا چند افراد پر ظلم نہیں کرتا بلکہ اپنے عمل سے یہ ثابت کرتا ہے کہ اس کا دل حیاتِ انسانی کے احترام سے اور ہمدردیِ نوع کے جذبے سے یکسر خالی ہے۔ لہٰذا وہ پوری انسانیت کا دشمن ہے۔ ایسے دشمن انسانیت سے زیادہ رذیل شخص کون ہو سکتا ہے؟ اور اس کے خبثِ باطن سے یہ بات کس طرح بعید ہے کہ اگر اسے پوری نوعِ بشری کو قتل کرنے کا موقع میسر آئے تو وہ اس سے پرہیز کرے گا۔

محولہ بالا آیت میں اس حقیقت کی طرف اشارہ بھی موجود ہے کہ جب ایک مرتبہ کسی شخص یا گروہ کے مُنہ کو انسانی خُون کی چاٹ لگ جاتی ہے تو پھر کسی انسان کی جان محفوظ نہیں رہتی۔ ایسا شخص یا گروہ ایک جان لینے کے بعد مطمئن نہیں ہوتا بلکہ دوسری جانوں کے درپے ہوتا ہے۔ یہاں تک پوری انسانیت کا لہو چاٹ لینے کے بعد وہ سیر نہیں ہونے پاتا بلکہ ہل من مزید کی دہائی دیتا ہوا اور انسانوں کی تلاش کرتا ہے تاکہ ان کے خون سے تسکین حاصل کرے۔

یوں تو ہر جُرم کسی معاشرے کی اخلاقی بربادی کا مُوجب بنتا ہے اور جو شخص سب سے پہلے اس کا ارتکاب کرتا ہے اس کی گردن پر اُن مجرموں کے بوجھ کا بھی ایک حصّہ لاد دیا جاتا ہے جو بعد میں اس کی شہ پاکر ظلم و تعدی کا یہ راستہ اختیار کرتے ہیں لیکن حدیث میں خاص طور پر قتل کے بارے میں اس امر کی صراحت کی گئی ہے کہ رُوئے زمین پر جو بھی قتلِ ناحق ہوتا ہے اُس کے وبال کا ایک حصّہ قابیل کے نامۂ اعمال میں لکھ دیا جاتا ہے کہ اس جور و ستم کا بانی تو وہی تھا۔

حضور سرورِ دو عالمؐ نے اپنے مخصوص انداز میں اس حقیقت کو یُوں بیان فرمایا:

لا تُقتل نفسٌ ظلماً اِلّا کان علی ابن آدم الاول کفلٌ من دمھا لانه کان اول من سنّ القتل۔

جب ظلم (ناحق) سے کوئی خون ہوتا ہے تو آدمؑ کے پہلے بیٹے (قابیل) پر اس کے خون (ناحق) کا بوجھ پڑتا ہے کیونکہ اس نے سب سے پہلے قتل کی رہ نکالی۔

وہ ماہرینِ نفسیات جنہوں نے جرائم اور ان کے محرکات اور انسانی زندگی پر اُن کے اثرات کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے وہ اس بات پر قریب قریب متفق ہیں کہ کسی انسان کے لیے سب سے بڑا جرم اور اس بنا پر اُس کی طبیعت کے لیے سب سے مشکل کام قتلِ انسانی ہے۔ چنانچہ قاتل جب تک جوہرِ انسانیت

کو بکبر بیباک کر ظالم و درندہ نہیں بن جاتا وہ اس جرم کا ارتکاب نہیں کر سکتا۔ انسانی فطرت کا خمیر تعمیری رجحانات سے اٹھایا گیا ہے، تخریبی سے نہیں اس لیے وہ جب تک نفس کی ساری خباثتوں اور غلاظتوں سے اپنے دل کو ڈھانپ نہیں لیتا وہ اس وقت تک انسانی زندگی پر ہاتھ ڈالنے پر آمادہ نہیں ہو سکتا۔ اس کے علاوہ اس جرم میں خوف کا عنصر بھی غیر معمولی طور پر شامل ہوتا ہے کیونکہ کسی دوسرے فرد کی جان پر حملہ درحقیقت اس کی اپنی جان کے خلاف ایک خوفناک سازش ہوتی ہے مگر ایک مرتبہ وہ جب کسی انسان کے خون سے ہاتھ رنگ لیتا ہے تو آہستہ آہستہ اس کے خوف میں کمی آنا شروع ہو جاتی ہے اور آخر کار انسانی جان کا زیاں اس کے نزدیک کھیل تماشے کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔

کسی فرد یا چند افراد کا عام حالات میں قتل اگر اتنے سنگین نتائج پیدا کر سکتا ہے تو اس قتل کی تباہ کاریوں کا اندازہ کیجیے جس کا ارتکاب سیاسی اختلافات کی وجہ سے کیا جاتا ہے۔ حکومت کے انتظام و انصرام کے طریق کار کو عرفِ عام میں سیاست کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں حتمیت اور قطعیت کی توقع نہیں کی جا سکتی جو عام طور پر سائنسی علوم یا مذہبی معتقدات میں پائی جاتی ہے۔ سیاسی امور میں اختلاف رائے کا ہونا اتنا ہی فطری ہے جتنا کہ کسی ذی روح میں سانس کی گردش۔ اس بنا پر دنیا کا ہر صحت مند معاشرہ سیاسی میدان میں اختلافات کے وجود کو تسلیم کرتے ہوئے آگے بڑھتا ہے اور اُسے اجتماعی ترقی کی سب سے نمایاں علامت سمجھتا ہے۔ البتہ وہ اس بات کا ضرور خیال رکھتا ہے کہ سیاسی اختلاف کی آڑ میں ملک و ملت کی تباہی کا سامان نہ کیا جائے۔ اس خطرے کے تدارک کے لیے ایک لگا بندھا طریق یہ وضع کیا گیا ہے کہ ہر معاشرہ پہلی منزل پر یہ طے کر لیتا ہے کہ اُسے کن اساسی تصورات کے علمبردار کی حیثیت سے دنیا میں زندہ رہنا ہے اور کن مقاصد کی تکمیل کے لیے سرگرم عمل ہونا ہے۔ یہ اساسی تصورات اس معاشرے کی تشکیل میں بنیاد کا کام بھی دیتے ہیں اور اُس کی زندگی کے مختلف خانوں میں مخصوص رنگ بھر کر اُسے دوسرے معاشروں سے ممیز و ممتاز بھی کرتے ہیں، پھر ان امتیازات سے اُس کی نظریاتی سرحدیں تعمیر پاتی ہیں۔ مقاصد کا تعیّن اس کی جدوجہد کا رُخ متعین کرتا ہے جس سے اس کے اندر اخلاقی احساسات اُبھرتے ہیں۔ جو قومیں عزت و وقار کے ساتھ زندہ رہنے کا عزم رکھتی ہیں وہ دوسرے

نقصانات تو برداشت کر لیتی ہیں مگر کبھی اس بات کو گوارا نہیں کرتیں کہ اُن کی زندگی کی اساس، ان کی نظریاتی سرحدوں اور اُن کے نصب العین کو کسی طرح گزند پہنچے۔ وہ ان کا پُوری قوت سے تحفظ کرتی ہیں اور جو لوگ ان کی طرف میلی نظر سے بھی دیکھتے ہیں۔ خواہ وہ باہر کے دشمن ہوں یا گھر کے تخریب کار، وہ ان کا سختی سے محاسبہ کرتی ہیں۔ دنیائے مغرب میں ریاست اور حکومت کے مابین جو لطیف سا فرق پایا جاتا ہے وہ اجتماعی زندگی کی اساس اور نظریاتی سرحدوں کے بارے میں اہلِ مغرب کے غیر معمولی احساس کا نتیجہ ہے۔ ان دائروں میں ان کا احساس اس حد تک بڑھا ہوا ہے کہ انہوں نے ریاست کے اندر الوہیت کی شان پیدا کر دی ہے۔ ریاست کو ایک محسوس اجتماعی ڈھانچے سے اٹھا کر مجرد نظامِ فکر کی سطح پر لے جانا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ مغرب کے سیاستدان ریاست کو اپنی قومی زندگی کے اساسی تصورات کا ہیولا سمجھتے ہیں اور ان اساسی تصورات کے تقدس کی وجہ سے انہوں نے ریاست کے اندر شانِ کبریائی پیدا کی ہے۔ وہ اگر ریاست اور حکومت کے مابین یہ تفریق نہ کرتے اور اپنے اساسی نظریات کو اسی مقام پر رکھتے جس مقام پر کہ انہوں نے حکومت کو رکھا ہے تو اُن کا اجتماعی ڈھانچہ کبھی کا منتشر ہو چکا ہوتا۔

اسلام میں چونکہ خداوند تعالیٰ کی ذات کے علاوہ کوئی دوسری ذات صفتِ الوہیت سے متصف تصور نہیں کی جا سکتی۔ اس لیے مسلمانوں کی پوری تاریخ میں کبھی بھی ریاست کو اہلِ مغرب کی طرح کبریائی کے مقام پر فائز نہیں کیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں سیاست کے بارے میں جو ادب ملتا ہے اس میں ریاست اور حکومت کے درمیان وہ واضح فرق محسوس نہیں ہوتا جو مغربی سیاست میں پایا جاتا ہے۔ ریاست اور حکومت کو ہم معنی سمجھنے کے باوجود اگر مسلمانوں کے نظم اجتماعی کو اُن کے دَورِ عروج میں کوئی نقصان نہیں پہنچا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے اساسی تصورات اور معتقدات سے کبھی اغماض نہیں برتا۔ ان کے سامنے یہ حقیقت برابر موجود رہی کہ ان کی بقا کا سارا دار و مدار اُن تصورات اور معتقدات کے تحفظ اور اُن کے ساتھ غیر معمولی وابستگی پر ہے اس لیے انہوں نے ان پر کسی قسم کی آنچ نہ آنے دی اور اُن کی حفاظت اور پاسبانی کا فرض بڑی دلسوزی اور احساسِ ذمہ داری کے ساتھ ادا کیا جیسا کہ مغربی نیشنلزم کے پرستار آج کل کی الوہیت کی حامل ریاستوں کا کرتے ہیں۔

مگر حکومت کے بارے میں فاشسٹ ریاستوں کے علاوہ کسی نے بھی غیر مشروط اطاعت کا رویہ اختیار نہیں کیا۔ ملکی نظام و انصرام میں اختلافِ رائے کی گنجائش ہمیشہ رہی ہے اور اسے ہر عادل حکمران نے بڑی خوشدلی کے ساتھ برداشت کیا ہے بلکہ اگر اس نے کبھی یہ محسوس کیا کہ عوام اپنی رائے کو بے کم و کاست بیان کرنے میں تامل کر رہے ہیں تو اُسے اس کی فکر لاحق ہوتی اور جب تک اس رجحان میں نمایاں تبدیلی نہ ہوئی اس وقت تک وہ اصلاحِ حال میں پیہم مصروف رہا۔ حکومت کا فرض اس کے علاوہ اور کیا ہے کہ وہ شہریوں کے جان و مال کی حفاظت کے علاوہ اُن تخیلات کو بروئے کار لانے کی کوشش کرے جو اُس کے شہریوں نے اجتماعی زندگی کی اساس کے طور پر قبول کر رکھے ہیں۔ حکومت کا زیادہ تر تعلق عملی مسائل اور دشواریوں سے ہوتا ہے اور اس میں اختلاف رائے کا اُبھرنا بالکل طبعی امر ہے۔ اگر اساسی نظریات کے دائرے میں اختلاف کسی قوم کو انتشار میں مبتلا کرتا ہے تو امورِ مملکت میں اختلاف کو دبانے سے آمریت کی راہ ہموار ہوتی ہے

بدقسمتی سے پاکستان ایک ایسا ملک ہے جہاں اجتماعی صورتِ حال سب سے مختلف اور سب سے نرالی ہے۔ حضور سرورِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے زمانے میں اجتماعی زندگی کی اساس کے تحفظ کا پورا پورا انتظام موجود تھا اور اس کے کسی گوشے میں معمولی سا نقصان بھی گوارا نہ کیا جاتا تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جس جوش اور ولولے اور جس دینی حمیت کے ساتھ مانعینِ زکوٰۃ کے خلاف جہاد کیا اس سے اس امر کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کسی اسلامی معاشرے کا دینی اساس کے ساتھ کس قدر گہرا تعلق ہوتا ہے اور ایک مسلمان حکمران پر اس معاملے میں کس قدر بھاری ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ لیکن جہاں تک امورِ مملکت کو چلانے کا تعلق ہے اس میں ہر قسم کے اختلافات بخوشی برداشت کیے جاتے تھے بلکہ خلفائے راشدین اسلامی مملکت کے شہریوں کو احتساب کے معاملے میں اُن کی ذمہ داریوں کا ہمیشہ احساس دلاتے اور جب کبھی وہ اُن کے اس احساس میں اضمحلال پاتے تو متفکر ہو جاتے۔

خلفائے راشدین کے بابرکت دور کے بعد جب ملوکیت کا دور شروع ہوا تو اگرچہ سیاسی حالات

(باقی صفحہ ۴ پر)

تفہیم القرآن

التکاثر

نام | پہلی آیت کے لفظ اَلتَّکَاثُر کو اس سُورۃ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول | ابوحیّان اور شوکانی کہتے ہیں کہ یہ تمام مفسّرین کے نزدیک مکّی ہے۔ اور امام سیوطی کا قول ہے کہ مشہور ترین بات یہی ہے کہ یہ مکّی ہے۔ لیکن بعض روایات ایسی ہیں جن کی بنا پر اسے مدنی کہا گیا ہے، اور وہ یہ ہیں:

ابن ابی حاتم نے ابو بُریدہؓ کی روایت نقل کی ہے کہ یہ سُورۃ انصار کے دو قبیلوں بنی حارثہ اور بنی الحرث کے بارے میں نازل ہوئی۔ دونوں قبیلوں نے ایک دوسرے کے مقابلے میں پہلے اپنے زندہ آدمیوں کے مفاخر بیان کیے، پھر قبرستان جا کر اپنے اپنے مرے ہوئے لوگوں کے مفاخر پیش کیے۔ اس پر یہ ارشادِ الٰہی نازل ہوا کہ اَلْھٰکُمُ التَّکَاثُرُ۔ لیکن شانِ نزول کے بارے میں صحابہ و تابعین کا جو طریقہ تھا، اُس کو اگر نگاہ میں رکھا جائے تو یہ روایت [illegible] کی دلیل نہیں ہے کہ سُورۂ تکاثر اسی موقع پر نازل ہوئی تھی، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ ان دونوں قبیلوں کے اِس فعل پر یہ سُورۃ چسپاں ہوتی ہے۔

امام بخاری اور ابن جریر نے حضرت اُبَیّ بن کعبؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اِس ارشاد کو کہ لو ان لابن ادم وادیین من مال لتمنّٰی وادیًا ثالثا ولا یملأ جوف ابن ادم الا التراب (اگر آدم زاد کے پاس دو وادیاں بھر کر مال ہو تو وہ تیسری وادی کی تمنا کریگا۔ ابنِ آدم کا پیٹ مٹی کے سوا کسی چیز سے نہیں بھر سکتا) قرآن میں سے سمجھتے تھے، یہاں تک کہ اَلْھٰکُمُ التَّکَاثُرُ نازل ہوئی۔" اس حدیث کو سورۂ تکاثر کے مدنی ہونے کی دلیل اس بنا پر قرار دیا

گیا ہے کہ حضرت اُبَیؓ مدینے میں مسلمان ہوئے تھے۔ مگر حضرت اُبَیؓ کے اس بیان سے یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ صحابۂ کرام کس معنی میں حضورؐ کے اِس ارشاد کو قرآن میں سے سمجھتے تھے۔ اگر اس کا مطلب یہ ہو کہ وہ اسے قرآن کی ایک آیت سمجھتے تھے تو یہ بات ماننے کے لائق نہیں ہے، کیونکہ صحابہ کی عظیم اکثریت اُن اصحاب پر مشتمل تھی جو قرآن کے حرف حرف سے واقف تھے، ان کو یہ غلط فہمی کیسے لاحق ہو سکتی تھی کہ یہ حدیث قرآن کی ایک آیت ہے۔ اور اگر قرآن میں سے ہونے کا مطلب قرآن سے ماخوذ ہونا لیا جائے تو اس روایت کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مدینۂ طیبہ میں جو اصحاب داخلِ اسلام ہوئے تھے انہوں نے جب پہلی مرتبہ حضورؐ کی زبانِ مبارک سے یہ سُورۃ سنی تو انہوں نے یہ سمجھا کہ یہ ابھی نازل ہوئی ہے، اور پھر حضورؐ کے مذکورۂ بالا ارشاد کے متعلق اُن کو یہ خیال ہوا کہ وہ اِسی سُورۃ سے ماخوذ ہے۔

ابنِ جریر، ترمذی اور ابن المنذر وغیرہ محدّثین نے حضرت علیؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "ہم عذابِ قبر کے بارے میں برابر شک میں پڑے رہے یہاں تک کہ اَلْھٰکُمُ التَّکَاثُرُ نازل ہوئی۔" اِس کو سُورۃ تکاثر کے مدنی ہونے کی دلیل اس بنا پر قرار دیا گیا ہے کہ عذابِ قبر کا ذکر مدینے ہی میں ہوا تھا، مکہ میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہوا تھا۔ مگر یہ بات غلط ہے۔ قرآن کی مکّی سُورتوں میں بکثرت مقامات پر قبر کے عذاب کا ایسے صریح الفاظ میں ذکر کیا گیا ہے کہ شک کی گنجائش نہیں رہتی۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو الانعام، آیت ۹۳۔ النحل، ۲۸۔ المومنون ۹۹-۱۰۰۔ المومن ۴۵-۴۶۔ یہ سب مکّی سُورتیں ہیں۔ اس لیے حضرت علیؓ کے ارشاد سے اگر کوئی چیز ثابت ہوتی ہے تو وہ یہ ہے کہ مذکورۂ بالا مکّی سُورتوں کے نزول سے پہلے سُورۃ تکاثر نازل ہو چکی تھی، اور اُس کے نزول نے عذابِ قبر کے بارے میں صحابہؓ کے شک کو دُور کر دیا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ ان روایات کے باوجود مفسّرین کی عظیم اکثریت اس کے مکّی ہونے پر متفق ہے۔ ہمارے نزدیک صرف یہی نہیں کہ یہ مکّی سُورۃ ہے، بلکہ اس کا مضمون اور اندازِ بیان یہ بتا رہا ہے کہ یہ مکّے کے ابتدائی دور کی نازل شدہ سُورتوں میں سے ہے۔

موضوع اور مضمون | اِس میں لوگوں کو اُس دنیا پرستی کے بُرے انجام سے خبردار کیا گیا ہے جس کی وجہ سے وہ مرتے دم تک زیادہ سے زیادہ مال و دولت، اور دنیوی فائدے اور لذتیں اور

جاہ و اقتدار حاصل کرنے اور اُس میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے، اور انہی چیزوں کے حصول پر فخر کرنے میں لگے رہتے ہیں، اور اِس ایک فکر نے اُن کو اس قدر منہمک کر رکھا ہے کہ انہیں اس سے بالاتر کسی چیز کی طرف توجہ کرنے کا ہوش ہی نہیں ہے۔ اِس کے بُرے انجام پر متنبّہ کرنے کے بعد لوگوں کو یہ بتایا گیا ہے کہ یہ نعمتیں جن کو تم یہاں بے فکری کے ساتھ سمیٹ رہے ہو، یہ محض نعمتیں ہی نہیں ہیں بلکہ تمہاری آزمائش کا سامان بھی ہیں۔ ان میں سے ہر نعمت کے بارے میں تم کو آخرت میں جواب دہی کرنی ہو گی۔

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے

تم لوگوں کو زیادہ سے زیادہ اور ایک دوسرے سے بڑھ کر دُنیا حاصل کرنے کی دُھن نے غفلت میں ڈال رکھا ہے[1] یہاں تک کہ (اِسی فکر میں) تم لب گور تک پہنچ جاتے ہو۔[2] ہرگز نہیں،

---

[1] اصل میں اَلْهٰىكُمُ التَّكَاثُرُ فرمایا گیا ہے جس کے معنی میں اتنی وسعت ہے کہ ایک پوری عبارت میں بمشکل اس کو ادا کیا جا سکتا ہے۔

اَلْهٰىكُمْ لہو سے ہے جس کے اصل معنی غفلت کے ہیں، لیکن عربی زبان میں یہ لفظ ہر اُس شغل کے لیے بولا جاتا ہے جس سے آدمی کی دلچسپی اتنی بڑھ جائے کہ وہ اس میں منہمک ہو کر دوسری اہم تر چیزوں سے غافل ہو جائے۔ اس مادّے سے جب اَلْهٰىكُمْ کا لفظ بولا جائے گا تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ کسی لہو نے تم کو اپنے اندر ایسا مشغول کر لیا ہے کہ تمہیں کسی اور چیز کا جو اُس سے اہم تر ہے، ہوش باقی نہیں رہا ہے۔ اُسی کی دُھن تم پر سوار ہے۔ اُسی کی فکر میں تم لگے ہوئے ہو۔ اور اس اِنہماک نے تم کو بالکل غافل کر دیا ہے۔

تکاثُر کثرت سے ہے، اور اس کے تین معنی ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی زیادہ سے زیادہ کثرت حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ دوسرے یہ کہ لوگ کثرت کے حصول میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کریں۔ تیسرے یہ کہ لوگ ایک دوسرے کے مقابلے میں اِس بات پر فخر جتائیں کہ انہیں دوسروں سے زیادہ کثرت حاصل ہے

پس اَلْهٰىكُمُ التَّكَاثُرُ کے معنی ہوتے تکاثُر نے تمہیں اپنے اندر ایسا مشغول کر لیا ہے کہ اُس کی دُھن نے تمہیں اُس سے اہم تر چیزوں سے غافل کر دیا ہے۔ اس فقرے میں یہ تصریح نہیں کی گئی ہے کہ تکاثُر میں کس چیز کی کثرت اور اَلْهٰىكُمْ میں کس چیز سے غافل ہو جانا مراد ہے، اور اَلْهٰىكُمْ (تم کو غافل کر دیا ہے) کے مخاطب

کون لوگ ہیں۔ اِس عدمِ تصریح کی وجہ سے اِن الفاظ کا اطلاق اپنے وسیع ترین مفہوم پر ہو جاتا ہے۔ تکاثر کے معنی محدود نہیں رہتے بلکہ دنیا کے تمام فوائد و منافع، سامانِ عیش، اسبابِ لذّت، اور وسائلِ قوت و اقتدار کو زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کی سعی و جہد کرنا، ان کے حصول میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کرنا، اور ایک دوسرے کے مقابلے میں ان کی کثرت پر فخر جتانا اُس کے مفہوم میں شامل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اَلْہٰکُم کے مخاطب بھی محدود نہیں رہتے بلکہ ہر زمانے کے لوگ اپنی انفرادی حیثیت سے بھی اور اجتماعی حیثیت سے بھی اُس کے مخاطب ہو جاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہو جاتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ دنیا حاصل کرنے، اور اس میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے، اور دوسروں کے مقابلے میں اُس پر فخر جتانے کی دُھن افراد پر بھی سوار ہے اور اقوام پر بھی۔ اسی طرح اَلْہٰکُمُ التَّکَاثُرُ میں چونکہ اس امر کی صراحت نہیں کی گئی کہ تکاثُر نے لوگوں کو اپنے اندر منہمک کر کے کس چیز سے غافل کر دیا ہے، اس لیے اُس کے مفہوم میں بھی بڑی وسعت پیدا ہو گئی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ لوگوں کو اس تکاثُر کی دُھن نے ہر اُس چیز سے غافل کر دیا ہے جو اس کی بہ نسبت اہم تر ہے۔ وہ خدا سے غافل ہو گئے ہیں۔ عاقبت سے غافل ہو گئے ہیں۔ اخلاقی حدود اور اخلاقی ذمہ داریوں سے غافل ہو گئے ہیں۔ حق داروں کے حقوق اور ان کی ادائیگی کے معاملہ میں اپنے فرائض سے غافل ہو گئے ہیں۔ انہیں معیارِ زندگی بلند کرنے کی فکر ہے، اس بات کی کوئی فکر نہیں کہ معیارِ آدمیت کس قدر گر رہا ہے۔ انہیں عیش و عشرت اور جسمانی لذّتوں کے سامان زیادہ سے زیادہ مطلوب ہیں، اِس ہوس رانی میں غرق ہو کر وہ اِس بات سے بالکل غافل ہو گئے ہیں کہ اِس روش کا انجام کیا ہے۔ انہیں زیادہ سے زیادہ طاقت، زیادہ فوجیں، زیادہ سے زیادہ ہتھیار فراہم کرنے کی فکر ہے، اور اس معاملہ میں ان کے درمیان ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی دوڑ جاری ہے، اس بات کی فکر انہیں نہیں ہے کہ یہ سب کچھ خدا کی زمین کو ظلم سے بھر دینے اور انسانیت کو تباہ و برباد کر دینے کا سروسامان ہے۔ غرض تکاثُر کی بے شمار صورتیں ہیں جنہوں نے اشخاص اور اقوام سب کو اپنے اندر ایسا مشغول کر رکھا ہے کہ انہیں دنیا اور اس کے فائدوں اور لذّتوں سے بالاتر کسی چیز کا ہوش نہیں رہا ہے۔

سلے یعنی تم اپنی ساری عمر اسی کوشش میں کھپا دیتے ہو اور مرتے دم تک یہ فکر تمہارا پیچھا نہیں چھوڑتی۔

عنقریب تم کو معلوم ہو جائے گا۔[۱] پھر (سُن لو کہ) ہرگز نہیں، عنقریب تم کو معلوم ہو جائے گا ہرگز نہیں، اگر تم یقینی علم کی حیثیت سے (اِس روش کے انجام کو) جانتے ہوتے (تو تمہارا یہ طرزِ عمل نہ ہوتا)۔ تم دوزخ دیکھ کر رہو گے، پھر (سُن لو کہ) تم بالکل یقین کے ساتھ اُسے دیکھ لو گے۔ پھر ضرور اُس روز تم سے اِن نعمتوں کے بارے میں جواب طلبی کی جائے گی۔[۲] ع ۱

---

[۱] یعنی تمہیں یہ غلط فہمی ہے کہ متاعِ دنیا کی یہ کثرت، اور اس میں دوسروں سے بڑھ جانا ہی ترقی اور کامیابی ہے۔ حالانکہ یہ ہرگز ترقی اور کامیابی نہیں ہے۔ عنقریب اِس کا بُرا انجام تمہیں معلوم ہو جائے گا اور تم جان لوگے کہ یہ کتنی بڑی غلطی تھی جس میں تم عمر بھر مبتلا رہے۔ عنقریب سے مراد آخرت بھی ہو سکتی ہے، کیونکہ جس ہستی کی نگاہ ازل سے ابد تک تمام زمانوں پر حاوی ہے، اس کے لیے چند ہزار یا چند لاکھ سال بھی زمانے کا ایک چھوٹا سا حصّہ ہیں۔ لیکن اس سے مراد موت بھی ہو سکتی ہے، کیونکہ وہ تو کسی انسان سے بھی کچھ زیادہ دُور نہیں ہے، اور یہ بات مرتے ہی انسان پر کُھل جائے گی کہ جن مشاغل میں وہ اپنی ساری عمر کھپا کر آیا ہے وہ اس کے لیے سعادت و خوش بختی کا ذریعہ تھے یا بدانجامی و بدبختی کا ذریعہ۔

[۲] اِس فقرے میں "پھر" کا لفظ اس معنی میں نہیں ہے کہ دوزخ میں ڈالے جانے کے بعد جواب طلبی کی جائے گی۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ پھر یہ خبر بھی ہم تمہیں دیے دیتے ہیں کہ تم سے اِن نعمتوں کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔ اور ظاہر ہے کہ یہ سوال عدالتِ الٰہی میں حساب لینے کے وقت ہو گا۔ اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ متعدد احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو نعمتیں بندوں کو دی ہیں ان کے بارے میں جواب دہی مومن و کافر سب ہی کو کرنی ہو گی۔ یہ الگ بات ہے کہ جن لوگوں نے کُفرانِ نعمت نہیں کیا اور شکر گزار بن کر رہے وہ اس محاسبہ میں کامیاب رہیں گے، اور جن لوگوں نے اللہ کی نعمتوں کا حق ادا نہیں کیا اور اپنے قول یا عمل سے، یا دونوں سے ان کی ناشکری کی وہ اس میں ناکام ہوں گے۔

حضرت جابرؓ بن عبداللہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے ہاں تشریف لائے اور ہم نے آپ کو تر و تازہ کھجوریں کھلائیں اور ٹھنڈا پانی پلایا۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا "یہ اُن نعمتوں میں سے ہیں جن کے بارے میں تم سے سوال کیا جائے گا" (مسند احمد، نسائی، ابن جریر، ابن المُنذِر، ابن مَردُویہ،

عبد بن حُمید، بیہقی فی الشعب)۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ سے کہا کہ چلو ابوالہیثم بن التیہان انصاری کے ہاں چلیں۔ چنانچہ ان کو لیکر آپؐ ابن التیہان کے نخلستان میں تشریف لے گئے۔ انہوں نے لاکر کھجوروں کا ایک خوشہ رکھ دیا۔ حضورؐ نے فرمایا تم خود کیوں نہ کھجوریں توڑ لائے؟ انہوں نے عرض کیا، میں چاہتا تھا کہ آپ حضرات خود چھانٹ چھانٹ کر کھجوریں تناول فرمائیں۔ چنانچہ انہوں نے کھجوریں کھائیں اور ٹھنڈا پانی پیا۔ فارغ ہونے کے بعد حضورؐ نے فرمایا "اُس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، یہ ان نعمتوں میں سے ہے جن کے بارے میں تمہیں قیامت کے روز جوابدہی کرنی ہوگی، یہ ٹھنڈا سایہ، یہ ٹھنڈی کھجوریں، یہ ٹھنڈا پانی" (اس قصے کو مختلف طریقوں سے مسلم، ابن ماجہ، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن جریر اور ابویعلیٰ وغیرہم نے حضرت ابوہریرہؓ سے نقل کیا ہے جن میں سے بعض میں اُن انصاری بزرگ کا نام لیا گیا ہے اور بعض میں صرف انصار میں سے ایک شخص کہا گیا ہے۔ اسی قصے کو مختلف طریقوں سے متعدد تفصیلات کے ساتھ ابن ابی حاتم نے حضرت عمرؓ سے، اور امام احمد نے ابوعسیب، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام سے نقل کیا ہے۔ ابنِ حبان اور ابنِ مردویہ نے حضرت عبداللہ بن عباس سے ایک روایت نقل کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قریب قریب اسی طرح کا ایک واقعہ حضرت ابوایوب انصاری کے ہاں پیش آیا تھا)۔

ان احادیث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سوال صرف کفار ہی سے نہیں، مومنین صالحین سے بھی ہوگا۔ رہیں خدا کی وہ نعمتیں جو اُس نے انسان کو عطا کی ہیں، تو وہ لامحدود ہیں، اُن کا کوئی شمار نہیں کیا جا سکتا، بلکہ بہت سی نعمتیں تو ایسی ہیں کہ انسان کو اُن کی خبر بھی نہیں ہے۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے کہ اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا "اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گنو تو تم ان کا پورا شمار نہیں کر سکتے" (ابراہیم۔ ۳۴)۔ ان نعمتوں میں سے بےحد و حساب نعمتیں تو وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ نے براہِ راست انسان کو عطا کی ہیں، اور بکثرت نعمتیں وہ ہیں جو انسان کو اُس کے اپنے کسب کے ذریعہ سے دی جاتی ہیں۔ انسان کے کسب سے حاصل ہونے والی نعمتوں کے متعلق اُس کو جوابدہی کرنی پڑیگی کہ اس نے ان کو کن طریقوں سے حاصل کیا اور کن راستوں میں خرچ کیا۔ اللہ تعالیٰ کی براہِ راست عطا کردہ نعمتوں کے بارے میں اُسے حساب دینا ہوگا کہ اُن کو اُس نے کس طرح استعمال کیا۔ اور مجموعی طور پر تمام نعمتوں کے متعلق اُس کو بتانا پڑے گا کہ آیا اُس نے اِس امر کا اعتراف کیا تھا کہ یہ نعمتیں اللہ کی عطا کردہ ہیں اور ان پر دل، زبان، اور عمل سے اُس کا شکر ادا کیا تھا؟ یا یہ سمجھا تھا کہ یہ سب کچھ اُسے اتفاقاً مل گیا ہے؟ یا یہ خیال کیا تھا کہ بہت سے خدا ان کے عطا کرنے والے ہیں؟ یا یہ عقیدہ رکھا تھا کہ یہ ہیں تو خدا ہی کی نعمتیں مگر ان کے عطا کرنے میں بہت سی دوسری ہستیوں کا بھی دخل ہے اور اس بنا پر انہیں معبود ٹھیرا لیا تھا اور انہی کے شکریے ادا کیے تھے؟

تفہیم القرآن

العصر

نام پہلی آیت کے لفظ العصر کو اس کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول اگرچہ مجاہد، قتادہ اور مُقاتِل نے اِسے مدنی کہا ہے، لیکن مفسّرین کی عظیم اکثریت اسے مکّی قرار دیتی ہے۔ اور اس کا مضمون یہ شہادت دیتا ہے کہ یہ مکّہ کے بھی ابتدائی دَور میں نازل ہوئی ہوگی جب اسلام کی تعلیم کو مختصر اور انتہائی دل نشین فقروں میں بیان کیا جاتا تھا، تاکہ سُننے والے ایک دفعہ اُن کو سُن کر بھولنا بھی چاہیں تو نہ بھُول سکیں، اور وہ آپ سے آپ لوگوں کی زبانوں پر چڑھ جائیں۔

موضوع اور مضمون یہ سورت جامع اور مختصر کلام کا بے نظیر نمونہ ہے۔ اِس کے اندر چند جچے تُلے الفاظ میں معنی کی ایک دنیا بھر دی گئی ہے جس کو بیان کرنے کا حق ایک پُوری کتاب میں بھی مشکل سے ادا کیا جاسکتا ہے۔ اِس میں بالکل دو ٹوک طریقہ سے بتا دیا گیا ہے کہ انسان کی فلاح کا راستہ کون سا ہے اور اس کی تباہی و بربادی کا راستہ کون سا۔ امام شافعی نے بہت صحیح کہا ہے کہ اگر لوگ اس سُورۃ پر غور کریں تو یہی ان کی ہدایت کے لیے کافی ہے۔ صحابۂ کرام کی نگاہ میں اِس کی اہمیت کیا تھی، اُس کا اندازہ اِس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن حِصْن الدارمی ابو مدینہ کی روایت کے مطابق اصحابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سے جب دو آدمی ایک دوسرے سے ملتے تو اس وقت تک جُدا نہ ہوتے جب تک ایک دوسرے کو سورۃ عصر نہ سُنا لیتے (طبرانی)۔

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے

زمانے کی قسم، انسان درحقیقت خسارے میں ہے، سوائے اُن لوگوں کے جو ایمان لائے، اور نیک اعمال کرتے رہے، اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرتے رہے۔ ع

لہ اِس سُورۃ میں زمانے کی قسم اِس بات پر کھائی گئی ہے کہ انسان بڑے خسارے میں ہے، اور اس خسارے سے صرف وہی لوگ بچے ہوئے ہیں جن کے اندر چار صفتیں پائی جاتی ہیں: (۱) ایمان۔ (۲) عملِ صالح۔ (۳) ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کرنا۔ (۴) ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرنا۔ اب اِس کے ایک ایک جُز کو الگ لے کر اس پر غور کرنا چاہیے تاکہ اِس ارشاد کا پُورا مطلب واضح ہو جائے۔

جہاں تک قسم کا تعلق ہے، اِس سے پہلے بارہا ہم اِس بات کی وضاحت کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوقات میں سے کسی چیز کی قسم اُس کی عظمت یا اُس کے کمالات و عجائب کی بنا پر نہیں کھائی ہے، بلکہ اِس بنا پر کھائی ہے کہ وہ اُس بات پر دلالت کرتی ہے جسے ثابت کرنا مقصود ہے۔ پس زمانے کی قسم کا مطلب یہ ہے کہ زمانہ اِس حقیقت پر گواہ ہے کہ انسان بڑے خسارے میں ہے سوائے اُن لوگوں کے جن میں یہ چار صفتیں پائی جاتی ہوں۔

زمانے کا لفظ گزرے ہوئے زمانے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، اور گزرتے ہوتے زمانے کے لیے بھی جس میں حال درحقیقت کسی لمبی مدت کا نام نہیں ہے۔ ہر آن گزر کر ماضی بنتی چلی جا رہی ہے، اور ہر آن آکر مستقبل کو حال، اور جا کر حال کو ماضی بنا رہی ہے۔ یہاں چونکہ مطلقاً زمانے کی قسم کھائی گئی ہے، اس لیے دونوں طرح کے زمانے اس کے مفہوم میں شامل ہیں۔ گزرے ہوئے زمانے کی قسم کھانے کا مطلب یہ ہے کہ انسانی تاریخ اِس بات پر شہادت دے رہی ہے کہ جو لوگ بھی اِن صفات سے خالی تھے وہ بالآخر خسارے میں پڑ کر رہے۔ اور گزرتے ہوتے زمانے کی قسم کھانے کا مطلب سمجھنے کے لیے پہلے یہ بات اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ جو زمانہ اب گزر رہا ہے وہ دراصل وہ وقت ہے جو ایک ایک شخص اور ایک ایک قوم کو دنیا میں کام کرنے کے لیے دیا گیا ہے۔ اُس کی مثال اُس وقت کی سی ہے جو امتحان گاہ میں طالب علم کو پرچے حل کرنے کے لیے دیا جاتا ہے۔ یہ وقت جس تیز رفتاری کے ساتھ گزر رہا ہے اس کا اندازہ تھوڑی دیر کے لیے

اپنی گھڑی میں سیکنڈ کی سوئی کو حرکت کرتے ہوئے دیکھنے سے آپ کو ہو جائے گا۔ حالانکہ ایک سیکنڈ بھی وقت کی بہت بڑی مقدار ہے۔ اسی ایک سیکنڈ میں روشنی ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل کا راستہ طے کر لیتی ہے، اور خدا کی خدائی میں بہت سی چیزیں ایسی بھی ہو سکتی ہیں جو اس سے بھی زیادہ تیز رفتار ہوں خواہ وہ ابھی تک ہمارے علم میں نہ آئی ہوں۔ تاہم اگر وقت کے گزرنے کی رفتار وہی سمجھ لی جائے جو گھڑی میں سیکنڈ کی سوئی کے چلنے سے ہم کو نظر آتی ہے، اور اس بات پر غور کیا جائے کہ ہم جو کچھ بھی اچھا یا بُرا فعل کرتے ہیں اور جن کاموں میں بھی ہم مشغول رہتے ہیں وہ سب کچھ اس محدود مدتِ عمر ہی میں وقوع پذیر ہوتا ہے جو دنیا میں ہم کو کام کرنے کے لیے دی گئی ہے، تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ہمارا اصل سرمایہ تو یہی وقت ہے جو تیزی سے گزر رہا ہے۔ امام رازی نے کسی بزرگ کا قول نقل کیا ہے کہ "میں نے سورۂ عصر کا مطلب ایک برف فروش سے سمجھا جو بازار میں آواز لگا رہا تھا کہ رحم کرو اُس شخص پر جس کا سرمایہ گھلا جا رہا ہے، رحم کرو اُس شخص پر جس کا سرمایہ گھلا جا رہا ہے۔ اُس کی یہ بات سُن کر میں نے کہا یہ ہے وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ کا مطلب۔ عمر کی جو مدت انسان کو دی گئی ہے وہ برف کے گھلنے کی طرح تیزی سے گزر رہی ہے۔ اس کو اگر ضائع کیا جائے، یا غلط کاموں میں صرف کر ڈالا جائے تو یہی انسان کا خسارہ ہے"۔ پس گزرتے ہوئے زمانے کی قسم کھا کر جو بات اس سورہ میں کہی گئی ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ تیز رفتار زمانہ شہادت دے رہا ہے کہ ان چار صفات سے خالی ہو کر انسان جن کاموں میں بھی اپنی مہلتِ عمر کو صرف کر رہا ہے وہ سب کے سب خسارے کے سودے ہیں۔ نفع میں صرف وہ لوگ ہیں جو اِن چاروں صفات سے متصف ہو کر دنیا میں کام کریں۔ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے ہم اُس طالب علم سے جو امتحان کے مقررہ وقت کو اپنا پرچہ حل کرنے کے بجائے کسی اور کام میں گزار رہا ہو، کمرے کے اندر لگے ہوئے گھنٹے کی طرف اشارہ کر کے کہیں کہ یہ گزرتا ہوا وقت بتا رہا ہے کہ تم اپنا نقصان کر رہے ہو، نفع میں صرف وہ طالب علم ہے جو اس وقت کا ہر لمحہ اپنا پرچہ حل کرنے میں صرف کر رہا ہے۔

انسان کا لفظ اگرچہ واحد ہے، لیکن بعد کے فقرے میں اُس سے اُن لوگوں کو مستثنیٰ کیا گیا ہے جو چار صفات سے متصف ہوں، اس لیے لامحالہ یہ ماننا پڑے گا کہ یہاں لفظ انسان اسمِ جنس کے طور پر استعمال کیا گیا ہے اور اُس کا اطلاق افراد، گروہوں، اقوام، اور پوری نوعِ انسانی پر یکساں ہوتا ہے۔ پس یہ حکم کہ مذکورہ چار صفات سے جو بھی خالی ہو وہ خسارے میں ہے، ہر حالت میں ثابت ہو گا، خواہ ان سے خالی کوئی شخص ہو، یا کوئی قوم، یا دنیا بھر کے انسان۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے ہم اگر یہ حکم لگائیں کہ زہر انسان کے لیے مہلک ہے تو اس کا

مطلب یہ ہوگا کہ زہر بہر حال مہلک ہے خواہ ایک فرد اس کو کھائے، یا ایک پُوری قوم، یا ساری دُنیا کے انسان مل کر اسے کھا جائیں۔ زہر کی مُہلک خاصیت اپنی جگہ اٹل ہے، اس میں اس لحاظ سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ایک شخص نے اس کو کھایا ہے، یا ایک قوم نے اسے کھانے کا فیصلہ کیا ہے، یا دنیا بھر کے انسانوں کا اجماع اس پر ہوگیا ہے کہ زہر کھانا چاہیے۔ ٹھیک اسی طرح یہ بات اپنی جگہ اٹل ہے کہ چار مذکورہ بالا صفات سے خالی ہونا انسان کے لیے خسارے کا موجب ہے۔ اس قاعدہ کلیہ میں اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کوئی ایک شخص اُن سے خالی ہے، یا کسی قوم نے، یا دنیا بھر کے انسانوں نے کفر، بدعملی، اور ایک دوسرے کو باطل کی ترغیب دینے اور بندگیٔ نفس کی تلقین کرنے پر اتفاق کرلیا ہے۔

اب یہ دیکھیے کہ خسارے کا لفظ قرآنِ مجید کس معنی میں استعمال کرتا ہے۔ لُغت کے اعتبار سے خَسارہ نفع کی ضد ہے، اور تجارت میں اس لفظ کا استعمال اُس حالت میں بھی ہوتا ہے جب کسی ایک سَودے میں گھاٹا آئے، اور اُس حالت میں بھی جب سارا کاروبار گھاٹے میں جا رہا ہو، اور اُس حالت میں بھی جب اپنا سارا سرمایہ کھو کر آدمی دیوالیہ ہو جائے۔ قرآن مجید اسی لفظ کو اپنی خاص اصطلاح بنا کر فلاح کے مقابلے میں استعمال کرتا ہے، اور جس طرح اُس کا تصور فلاح محض دنیوی خوشحالی کا ہم معنی نہیں ہے بلکہ دنیا سے لے کر آخرت تک انسان کی حقیقی کامیابی پر حاوی ہے، اسی طرح اُس کا تصورِ خُسران بھی محض دنیوی ناکامی یا خستہ حالی کا ہم معنی نہیں ہے بلکہ دنیا سے لے کر آخرت تک انسان کی حقیقی ناکامی و نامرادی پر حاوی ہے۔ فلاح اور خُسران، دونوں کے قرآنی تصور کی تشریح اس سے پہلے ہم متعدد مقامات پر کرچکے ہیں اس لیے اُن کے اعادے کی حاجت نہیں ہے (ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم، الاعراف، حاشیہ ۹۔ الانفال، حاشیہ ۳۰۔ یونس، حاشیہ ۲۳۔ بنی اسرائیل، حاشیہ ۱۰۲۔ جلد سوم، الحج، حاشیہ ۱۷۔ المومنون، حواشی ۱۔۲۔ ۱۱۔ ۵۰۔ جلد چہارم، لقمان، حاشیہ ۴۔ الزُّمر، حاشیہ ۳۴)۔ اس کے ساتھ یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ اگرچہ قرآن کے نزدیک حقیقی فلاح آخرت میں انسان کی کامیابی، اور حقیقی خسارہ وہاں اُس کی ناکامی ہے، لیکن اِس دنیا میں بھی جس چیز کا نام لوگوں نے فلاح رکھ چھوڑا ہے وہ دراصل فلاح نہیں ہے بلکہ اُس کا انجام خود اِسی دنیا میں خسارہ ہے، اور جس چیز کو لوگ خسارہ سمجھتے ہیں وہ دراصل خسارہ نہیں ہے بلکہ اِس دنیا میں بھی وہی فلاح کا ذریعہ ہے۔ اِس حقیقت کو قرآن مجید میں کئی مقامات پر بیان کیا گیا ہے اور ہر جگہ ہم نے اس کی تشریح کر دی ہے (ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم،

النحل، حاشیہ ۹۹۔ جلد سوم، مریم، حاشیہ ۵۲، طٰہٰ، حاشیہ ۱۰۵۔ جلد ششم، اللّیل، حواشی ۳۔۵)۔ پس جب قرآن پورے زور اور قطعیت کے ساتھ کہتا ہے کہ "درحقیقت انسان بڑے خسارے میں ہے"، تو اس کا مطلب دنیا اور آخرت دونوں کا خسارہ ہے، اور جب وہ کہتا ہے کہ اس خسارے سے صرف وہ لوگ بچے ہوئے ہیں جن کے اندر حسبِ ذیل چار صفات پائی جاتی ہیں، تو اِس کا مطلب دونوں جہانوں میں خسارے سے بچنا اور فلاح پانا ہے۔

اب ہمیں اُن چاروں صفات کو دیکھنا چاہیے جن کے پائے جانے پر اِس سُورۃ کی رُو سے انسان کا خسارے سے محفوظ رہنا موقوف ہے۔

ان میں پہلی صفت ایمان ہے۔ یہ لفظ اگرچہ بعض مقامات پر قرآن مجید میں محض زبانی اقرارِ ایمان کے معنی میں بھی استعمال کیا گیا ہے (مثلاً النساء، آیت ۱۳۷۔ المائدہ، آیت ۵۴، الانفال، آیت ۲۰، ۲۷، التوبہ، آیت ۳۸، اور الصّف، آیت ۲ میں)، لیکن اِس کا اصل استعمال سچے دل سے ماننے اور یقین کرنے کے معنی ہی میں کیا گیا ہے، اور عربی زبان میں بھی اِس لفظ کے یہی معنی ہیں۔ لُغت میں اٰمَنَ لَہٗ کے معنی ہیں صَدَّقَہٗ وَاعْتَمَدَ عَلَیْہِ (اس کی تصدیق کی اور اُس پر اعتماد کیا)، اور اٰمَنَ بِہٖ کے معنی ہیں اَیْقَنَ بِہٖ (اُس پر یقین کیا)۔ قرآن دراصل جس ایمان کو حقیقی ایمان قرار دیتا ہے، اُس کو اِن آیات میں پوری طرح واضح کر دیا گیا ہے:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا (الحجرات۔ ۱۵)	مومن تو حقیقت میں وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاتے اور پھر شک میں نہ پڑے۔
اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا (حٰمٓ السجدہ۔ ۳۰)	جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے اور پھر اس پر ڈٹ گئے۔
اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَجِلَتْ قُلُوْبُہُمْ (الانفال۔ ۲)	مومن تو حقیقت میں وہ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جاتے تو ان کے دل لرز جاتے ہیں۔
وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ۔ (البقرہ۔ ۱۶۵)	اور جو لوگ ایمان لاتے ہیں وہ سب سے بڑھ کر اللہ سے محبت رکھتے ہیں۔
فَلَا وَرَبِّکَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ	پس نہیں، (اے نبی) تمہارے رب کی قسم وہ ہرگز

فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا۔ (النساء-۶۵)

مومن نہیں ہیں جب تک کہ اپنے باہمی اختلاف میں تمہیں فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اُس پر اپنے دلوں میں بھی کوئی تنگی محسوس نہ کریں بلکہ سربسر تسلیم کرلیں۔

اِن سے بھی زیادہ اِس آیت میں زبانی اقرارِ ایمان اور حقیقی ایمان کا فرق ظاہر کیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ اصل مطلوب حقیقی ایمان ہے نہ کہ زبانی اقرار:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ (النساء-۱۳۶)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر۔

اب رہا یہ سوال کہ ایمان لانے سے کن چیزوں پر ایمان لانا مراد ہے، تو قرآن مجید میں پوری طرح اس بات کو بھی کھول کھول کر بیان کر دیا گیا ہے۔ اس سے مراد اولاً اللہ کو ماننا ہے محض اُس کے وجود کو ماننا نہیں بلکہ اِس حیثیت سے ماننا ہے کہ وہی ایک خدا ہے۔ خدائی میں کوئی اس کا شریک نہیں ہے۔ وہی اس کا مستحق ہے کہ انسان اُس کی عبادت، بندگی اور اطاعت بجالائے۔ وہی قسمتیں بنانے اور بگاڑنے والا ہے۔ بندے کو اسی سے دعا مانگنی چاہیے اور اسی پر توکل کرنا چاہیے۔ وہی حکم دینے اور منع کرنے والا ہے۔ بندے کا فرض ہے کہ اُس کے حکم کی اطاعت کرے اور جس چیز سے اُس نے منع کیا ہے اُس سے رُک جائے۔ وہ سب کچھ دیکھنے اور سُننے والا ہے۔ اُس سے انسان کا کوئی فعل تو درکنار، وہ مقصد اور نیت بھی مخفی نہیں ہے جس کے ساتھ اُس نے کوئی فعل کیا ہے۔ ثانیاً، رسول کو ماننا۔ اِس حیثیت سے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا مامور کیا ہوا ہادی و رہنما ہے، اور جس چیز کی تعلیم بھی اُس نے دی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، برحق ہے، اور واجب التسلیم ہے۔ اِسی ایمان بالرسالت میں ملائکہ، انبیاء اور کتبِ الٰہیہ پر، اور خود قرآن پر بھی ایمان لانا شامل ہے، کیونکہ یہ اُن تعلیمات میں سے ہے جو اللہ کے رسول نے دی ہیں۔ ثالثاً، آخرت کو ماننا اس حیثیت سے کہ انسان کی موجودہ زندگی پہلی اور آخری زندگی نہیں ہے، بلکہ مرنے کے بعد انسان کو دوبارہ زندہ ہو کر اُٹھنا ہے، اپنے اُن اعمال کا جو اُس نے دنیا کی اِس زندگی میں کیے ہیں خدا کو حساب دینا ہے، اور اس مُحاسبہ میں جو لوگ نیک قرار پائیں اُنہیں جزا، اور جو بد قرار پائیں اُن کو سزا ملنی ہے۔ یہ ایمان اخلاق اور سیرت و کردار کے لیے ایک مضبوط بنیاد فراہم کر دیتا ہے جس پر ایک پاکیزہ زندگی کی عمارت قائم ہو سکتی ہے۔ ورنہ جہاں سرے سے یہ ایمان ہی موجود نہ ہو وہاں انسان کی زندگی خواہ کتنی ہی خوشنما کیوں نہ ہو اُس کا

حال ایک بے لنگر کے جہاز کا سا ہوتا ہے جو موجوں کے ساتھ بہتا چلا جاتا ہے اور کہیں قرار نہیں پکڑ سکتا۔

ایمان کے بعد دوسری صفت جو انسان کو خسارے سے بچانے کے لیے ضروری ہے وہ صالحات (نیک کاموں) پر عمل کرنا ہے۔ صالحات کا لفظ تمام نیکیوں کا جامع ہے جس سے نیکی اور بھلائی کی کوئی قسم چھوٹی نہیں رہ جاتی۔ لیکن قرآن کی رو سے کوئی عمل بھی اُس وقت تک عمل صالح نہیں ہو سکتا جب تک اس کی جڑ میں ایمان موجود نہ ہو، اور وہ اُس ہدایت کی پیروی میں نہ کیا جائے جو اللہ اور اس کے رسول نے دی ہے۔ اسی لیے قرآن مجید میں ہر جگہ عملِ صالح سے پہلے ایمان کا ذکر کیا گیا ہے اور اِس سُورہ میں بھی اُس کا ذکر ایمان کے بعد ہی آیا ہے۔ کسی ایک جگہ بھی قرآن میں ایمان کے بغیر کسی عمل کو صالح نہیں کہا گیا ہے اور نہ عمل بلا ایمان پر کسی اجر کی امید دلائی گئی ہے۔ دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ایمان وہی معتبر اور مفید ہے جس کے صادق ہونے کا ثبوت انسان اپنے عمل سے پیش کرے۔ ورنہ ایمان بلا عمل صالح محض ایک دعویٰ ہے جس کی تردید آدمی خود ہی کر دیتا ہے جب وہ اس دعوے کے باوجود اللہ اور اس کے رسول کے بتائے ہوئے طریقے سے ہٹ کر چلتا ہے۔ ایمان اور عملِ صالح کا تعلق بیج اور درخت کا سا ہے۔ جب تک بیج زمین میں نہ ہو، کوئی درخت پیدا نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر بیج زمین میں ہو اور کوئی درخت پیدا نہ ہو رہا ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ بیج زمین میں دفن ہو کر رہ گیا۔ اسی بنا پر قرآنِ پاک میں جتنی بشارتیں بھی دی گئی ہیں اُنہی لوگوں کو دی گئی ہیں جو ایمان لا کر عملِ صالح کریں، اور یہی بات اِس سُورہ میں بھی کہی گئی ہے کہ انسان کو خسارے سے بچانے کے لیے جو دوسری صفت ضروری ہے وہ ایمان کے بعد صالحات پر عمل کرنا ہے۔ بالفاظِ دیگر عملِ صالح کے بغیر محض ایمان آدمی کو خسارے سے نہیں بچا سکتا۔

مذکورۂ بالا دو صفتیں تو وہ ہیں جو ایک ایک فرد میں ہونی چاہییں۔ اِس کے بعد یہ سُورۃ دو مزید صفتیں بیان کرتی ہے جو خسارے سے بچنے کے لیے ضروری ہیں، اور وہ یہ ہیں کہ یہ ایمان لانے اور عملِ صالح کرنے والے لوگ ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کریں۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ اوّل تو ایمان لانے اور نیک عمل کرنے والوں کو فرد فرد بن کر نہیں رہنا چاہیے بلکہ اُن کے اجتماع سے ایک مومن و صالح معاشرہ وجود میں آنا چاہیے۔ دوسرے، اِس معاشرے کے ہر فرد کو اپنی یہ ذمّہ داری محسوس کرنی چاہیے کہ وہ معاشرے کو بگڑنے نہ دے، اِس لیے اُس کے تمام افراد پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کو حق اور صبر کی تلقین کریں۔

حق کا لفظ باطل کی ضد ہے، اور بالعموم دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ایک، صحیح اور سچی اور مطابق

عدل و انصاف اور مطابقِ حقیقت بات، خواہ وہ عقیدہ و ایمان سے تعلق رکھتی ہو یا دنیا کے معاملات سے۔ دوسرے، وہ حق جس کا ادا کرنا انسان پر واجب ہو، خواہ وہ خدا کا حق ہو یا بندوں کا حق یا خود اپنے نفس کا حق۔ پس ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اہلِ ایمان کا یہ معاشرہ ایسا بے حس نہ ہو کہ اُس میں باطل سر اٹھا رہا ہو اور حق کے خلاف کام کیے جا رہے ہوں، مگر لوگ خاموشی کے ساتھ اس کا تماشا دیکھتے رہیں۔ بلکہ اس معاشرے میں یہ روح جاری و ساری رہے کہ جب اور جہاں بھی باطل سر اٹھائے کلمۂ حق کہنے والے اس کے مقابلے میں اٹھ کھڑے ہوں، اور معاشرے کا ہر فرد صرف خود ہی حق پرستی اور راستبازی اور عدل و انصاف پر قائم رہنے اور حق داروں کے حقوق ادا کرنے پر اکتفا نہ کرے بلکہ دوسروں کو بھی اسی طرزِ عمل کی نصیحت کرے۔ یہ وہ چیز ہے جو معاشرے کو اخلاقی زوال و انحطاط سے بچانے کی ضامن ہے۔ اگر یہ روح کسی معاشرے میں موجود نہ رہے تو وہ خُسران سے نہیں بچ سکتا اور اس خُسران میں وہ لوگ بھی آخر کار مبتلا ہو کر رہتے ہیں جو اپنی جگہ حق پر قائم ہوں مگر اپنے معاشرے میں حق کو پامال ہوتے دیکھتے رہیں۔ یہی بات ہے جو سورۂ مائدہ میں فرمائی گئی ہے کہ بنی اسرائیل پر حضرت داؤد اور حضرت عیسیٰ ابن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی اور اس لعنت کی وجہ یہ تھی کہ اُن کے معاشرے میں گناہوں اور زیادتیوں کا ارتکاب عام ہو رہا تھا اور لوگوں نے ایک دوسرے کو بُرے افعال سے روکنا چھوڑ دیا تھا (آیات ۷۸-۷۹)۔ پھر اسی بات کو سورۂ اعراف میں اس طرح بیان فرمایا گیا ہے کہ بنی اسرائیل نے جب کھلّم کھلّا سبت کے احکام کی خلاف ورزی کر کے مچھلیاں پکڑنی شروع کر دیں تو اُن پر عذاب نازل کر دیا گیا اور اُس عذاب سے صرف وہی لوگ بچائے گئے جو اس گناہ سے روکنے کی کوشش کرتے تھے (آیات ۱۶۳ تا ۱۶۶)۔ اور اسی بات کو سورۂ انفال میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ بچو اُس فتنے سے جس کی شامت مخصوص طور پر صرف اُنہی لوگوں تک محدود نہ رہے گی جنہوں نے تم میں سے گناہ کیا ہو (آیت ۲۵)۔ اسی لیے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو اُمتِ مسلمہ کا فریضہ قرار دیا گیا ہے (آل عمران - ۱۰۴) اور اس امت کو بہترین امت کہا گیا ہے جو یہ فریضہ انجام دے (آل عمران - ۱۱۰)

حق کی نصیحت کے ساتھ دوسری چیز جو اہلِ ایمان اور اُن کے معاشرے کو خسارے سے بچانے کے لیے شرطِ لازم قرار دی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اِس معاشرے کے افراد ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرتے رہیں۔ یعنی حق کی پیروی اور اُس کی حمایت میں جو مشکلات پیش آتی ہیں، اور اس راہ میں جن تکالیف سے،

جن مشقتوں سے، جن مصائب سے، اور جن نقصانات اور محرومیوں سے انسان کو سابقہ پیش آتا ہے ان کے مقابلے میں وہ ایک دوسرے کو ثابت قدم رہنے کی تلقین کرتے رہیں۔ اُن کا ہر فرد دوسرے کی ہمت بندھاتا رہے کہ وہ ان حالات کو صبر کے ساتھ برداشت کرے۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد ششم، الدّھر، حاشیہ ۱۶۔ البلد، حاشیہ ۱۴)۔

"قرآنِ مجید"

وہ عظیم المرتبت کتاب جو ملّتِ اسلامیہ کے وجود کی محافظ ہے اور جس کا محافظ خود خدا ہے

مگر دَورِ حاضر میں

پاکستان کے محققِ جلیل جناب مولانا ظفر اقبال کی تیس سالہ عرق ریزی اور تحقیق کے بعد
پیکیجز لمیٹڈ لاہور کی طرف سے شائع ہونے والا تجویدی قرآن مجید اپنی مثال نہیں رکھتا۔

آرٹ پیپر، اعلیٰ دو رنگی طباعت، جلی حروف۔ مع پلاسٹک کور۔ خوشنما ڈبے میں بند
سائز ۲۰×۳۰/۸ ۔ صفحات ۱۰۳۴۔ ہدیہ صرف ۳۲ روپے ڈاک خرچ بذمہ ادارہ

تفہیم القرآن کے اجزاء، البقرہ، المائدہ، یوسف، النور، الاحزاب کے بعد اسلامیات کے
طالب علموں کی سہولت کی خاطر

تفسیر سورۃ الحجرات، سورۃ لقمان

بھی علیحدہ کتابی شکل میں شائع ہو چکی ہیں

اب سورۃ الحجرات کا تیسرا اور سورۃ لقمان کا دوسرا ایڈیشن آگیا ہے۔

الحجرات۔ سائز ۱۸×۲۲/۸ صفحات ۵۶۔ آفسٹ سفید کاغذ۔ قیمت نیا ایڈیشن ۱-۸۰ روپیہ
لقمان " " " ۶۰ " " " " ۱-۵۰ "

ضرورت مند حضرات سے گذارش ہے کہ اپنے آرڈر سے جلد مطلع فرمائیں۔

ادارہ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور کو آرڈر دیجیے۔ فون نمبر ۵۲۵۰۷

شمالی امریکہ میں "جماعتِ اسلامی" کا قیام

از جناب کوکب صدیقی صاحب ، کینیڈا

سرمایہ دارانہ نظام ایک ناگزیر تاریخی عمل کے تحت سوشلزم اور کمیونزم کو جنم دیتا ہے ۔ کم از کم کارل مارکس نے انسانیت کے ارتقاء کے بارے میں جو افسانہ لکھا تھا اس میں یہی درج ہے ۔ اگر اس کہانی کا حقیقت سے کوئی تعلق ہوتا تو شاید امریکہ کے عوام کے لیے بھی تبدیلی کی امید پیدا ہو جاتی لیکن یہاں صورتِ حال یہ ہے کہ مزدور طبقہ اور اس کی نمائندہ تنظیمیں پوری قوم میں سب سے زیادہ رجعت پسند ہیں ۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ کا معاشی اور معاشرتی نظام مادہ پرستی اور ڈالر کے بندھنوں میں اتنی مضبوطی سے بندھا ہوا ہے کہ مظلوم طبقوں کے لیے بظاہر کوئی امید نظر نہیں آتی ۔ پسے ہوئے طبقوں میں سب سے بڑا اور اہم گروہ آبادی کا افریقی الاصل امریکی عنصر ہے ۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں یہاں حقارت سے نیگرو یا نگر کہا جاتا ہے ۔ انہی کے خون پسینے پر پچھلی صدیوں میں امریکی تہذیب کی عمارت قائم کی گئی تھی

ایفرو امریکی آبادی کی تاریخ استحصال ، ظلم اور زیادتی سے عبارت ہے ۔ افریقی نسل کے لوگوں کو امریکی معاشرے میں جذب کرنے اور انہیں گورے لوگوں کے برابر حقوق دلوانے کی کئی کوششیں امریکی حکومت کی طرف سے ہو چکی ہیں لیکن یہ سب مکمل طور پر ناکام رہیں ۔ مادہ پرستی فطری طور پر انسان کی خود غرضی کو ابھارتی ہے ۔ روحانی اقدار کی نفی ہو جانے کی وجہ سے تنگ نظری ، نسلی تعصب اور کئی قسم کی عصبیتوں کو فروغ حاصل ہوا ہے ۔ امریکہ عیسائیت کا سب سے بڑا علمبردار ہے لیکن خود اس کی حدود میں عیسائیت ناکام ہو چکی ہے اور افریقی نسل کے لوگوں کی ایک بڑی تعداد کے لیے تو بالکل بے معنی ہو کر رہ گئی ہے ۔ امریکی حکومت نے اس ناکامی کا اظہار اس طرح کیا کہ ایک اسکیم پیش کی گئی جس کے تحت کالے لوگوں کو واپس افریقہ جا کر بس جانے کے لیے مالی امداد اور قرضے دیئے جاتے تھے !

البفرو امریکی لیڈر نوبل پرائز یافتہ مارٹن لوتھر کنگ نے کالے رنگ کی آبادی کو گوروں کے برابر حقوق دلانے کی کوشش کی تھی۔ یہ لیڈر عیسائی مذہب کے تحت اُخوت چاہتا تھا۔ لیکن طریقِ کار خالص مادہ پرستانہ تھا۔ بالآخر ایک شخص نے کنگ کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ اس سے ثابت یہ ہوا کہ ذہنی تبدیلی سے پہلے انسانی اخوت اور برادری ممکن نہیں۔ کنگ کی موت نے کالے رنگ کے امریکیوں میں نسلی ردِ عمل پیدا کیا اور ان کالے گروہوں کو تقویت ہوئی جو کالوں کو ہر قیمت پر گوروں سے علیحدہ رکھنا چاہتے ہیں۔ ان گروہوں میں نام نہاد "کالے مسلمان" BLACK MUSLIMS اور کالے چیتے BLACK PANTHERS جو مارکسی عقائد رکھتے ہیں دونوں شامل ہیں۔ ان کا اپنا ذیلی کلچر اور طرزِ حیات ہے اور یہ ایسے پرچے بھی بڑی تعداد میں شائع کرتے ہیں جن کا مقصد کالی نسل پرستی کو فروغ دینا ہے۔ شروع شروع میں ان گروہوں کا زور بہت بڑھ گیا تھا لیکن آہستہ آہستہ پسے ہوئے طبقوں کو یہ احساس ہوا کہ سوشلسٹ ہوں یا "کالے مسلمان"، ہر دو گوری اکثریت کا ہاتھ بٹا رہے ہیں اور افریقی نسل کے لوگوں کو اسی پوزیشن میں رکھنا چاہتے ہیں جو گوری اکثریت کو منظور ہے۔

دنیا بھر کے آزاد ممالک کی طرح امریکہ میں بھی مارکسی عقائد رکھنے والے سوشلسٹوں کو اپنا کام کرنے کی پوری آزادی ہے۔ یہ لوگ کمیونسٹ ممالک مثلاً کیوبا سے امداد حاصل کرتے ہیں اور مظلوم طبقوں کے حامی بن کر سامنے آتے ہیں۔ دوسرے ممالک کی طرح یہاں بھی امریکی سیاسی مشینری ان بائیں بازو کے لوگوں کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتی ہے۔ مثلاً یہاں کے کالے سوشلسٹوں نے تشدد کا زبردست پرچار کیا اور کالی آبادی کے اندر دبی ہوئی بے چینی کو اُبھارا لیکن تشدد کا سارا نقصان کالی آبادی کو ہوتا ہے کیونکہ حکومت کی مسلح قوت کا مقابلہ اقلیت نہیں کر سکتی۔ سوشلسٹوں کی محنت کا سب سے بڑا فائدہ گورے نسل پرستوں کو ہوا کیونکہ تشدد نے نسلی عناد اور دُوری کو اور مستحکم کر دیا۔

امریکی عوام پر اب بڑی حد تک یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ امریکی تہذیب اور سوشلزم ہر دو میں نسلی تفریق کا کوئی حل نہیں ہے۔ امریکہ کے اکثر شہروں میں صورتِ حال یہ ہے کہ اگر ایک گورے محلے میں کالے کرایہ دار کو رہنے کی جگہ مل جاتی ہے تو پورے محلے میں کرائے گر جاتے ہیں اور کالے علاقوں میں گورے داخل ہوتے ہوئے جان کا خطرہ محسوس کرتے ہیں اور کئی جگہوں پر پولیس بھی بمشکل ہی داخل ہو سکتی ہے۔ پچھلے ۲۵ سال میں جیسے جیسے افریقی نسل کے لوگ روزگار کی تلاش میں شہروں میں داخل

ہوتے گئے گوروں نے شہر چھوڑ کر مضافات کا رُخ کیا۔ اس عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ ریاستہائے متحدہ کے تقریباً ہر بڑے شہر کے وسط میں افریقی نسل کے لوگوں کی بڑی تعداد آباد ہے اور مضافات اور چھوٹے شہروں میں گوری نسل۔ حال ہی میں صدر نکسن نے دونوں کو باہم ملانے کی ایک اور کوشش میں اسکول بسوں کا انتظام کیا جن کے ذریعے گوری نسل کے بچوں کو اندرونِ شہر اسکولوں میں لے جانے کا پروگرام تھا۔ اس اقدام کو خود گوری آبادی نے ناکام بنانے کی بھرپور سعی کی۔ زبردست مظاہرے ہوتے اور کئی جگہوں پر گورے بسوں کے سامنے لیٹ گئے۔

ریاستہائے متحدہ امریکہ کا مرکزی شہر واشنگٹن اب کالوں کی اکثریت کا شہر ہے۔ یہاں نوجوانوں کے ایک پرعزم گروہ نے ۱۹۷۲ء کے شروع میں ایک انقلابی قدم اٹھایا جس کی مثال امریکہ کی تاریخ میں نہیں ملتی اور وہ ہے "جماعت اسلامی شمالی امریکہ THE ISLAMIC PARTY IN NORTH AMERICA کا قیام۔ اس نظریاتی پارٹی کا مرکز الامۃ نامی مسجد میں ہے اور اس کے امیر یوسف مظفر الدین حمید ہیں۔ یوسف صاحب اور ان کے رفقاء کی ہمت کا اندازہ لگانے کے لیے یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ یہ پوری جماعت ان نومسلموں کی ہے جو پچھلے دس سال میں اسلام کی برکتوں سے مالامال ہوئے۔ ان کی تعداد کم لیکن عزائم بہت بلند ہیں۔ یوسف صاحب کا کہنا ہے کہ امریکہ کے تمام کمزور طبقوں کے مسائل کا حل اسلام ہے۔ قرآن اور حدیث کے مطالعے سے ان کو یقین ہو گیا ہے کہ اصل اور مکمل انقلاب، اسلامی انقلاب ہی ہو سکتا ہے، کیونکہ اسلام زندگی کے کسی ایک جُز کو درست کرنے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ شب و روز کے تمام معاملات پر حاوی ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ایمان کی دولت پا جانے کے بعد انسان کی زندگی میں مقصدیت کی حلاوت پیدا ہو جاتی ہے اور ہر ہر انسان کو تشخص (IDENTITY) احساسِ ذمہ داری اور امید کا جوہر حاصل ہوتا ہے۔ آسائشیں سمیٹنے کی اندھی دوڑ میں انسان بہت آسانی سے حکمرانوں اور سرمایہ داروں کے جال میں پھنس جاتا ہے جس شخص کا خدا خود اس کا نفس ہو وہ اسی کی پیروی کرے گا جو اس کے نفس کی تسکین کر سکے۔ بقول امیر مظفر الدین صدر نکسن کی قوتِ قاہرہ کا سدباب کرنے کی ابتدا کم از کم اس طرح ہونی چاہیے کہ انسان خود اپنی شراب نوشی یا نشے کی عادت کا تختہ اُلٹ سکے۔ دراصل امریکہ کے حالات کو دیکھتے ہوئے مظفر الدین صاحب کا یہ تجزیہ بالکل درست ہے۔ ایفرو امریکی آبادی کے ایک قابلِ ذکر حصے کو امریکی معاشرے کے دباؤ نے

اخلاقی کمزوریوں میں اس طرح ملوث کیا ہے کہ اُن کی زندگی ایک طویل گناہ بن کر رہ گئی ہے۔ کئی لوگ یہاں ایسے بھی پائے جاتے ہیں کہ اُن کے پاس کھانے کے لیے کافی رقم نہیں ہوتی لیکن وہ تمام بچی کھچی پونجی ماہانہ قسطوں میں ادا کر کے لمبی لمبی کاروں کے مالک بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ واضح رہے کہ امریکہ میں کاروبار کرنے والوں نے یہ چکر چلا رکھا ہے کہ بے پناہ اشتہار بازی کے زور سے عوام کو آمادہ کرتے ہیں کہ وہ آرام اور سامانِ عیش کے حصول کو زندگی کا مقصد سمجھ لیں۔ یہاں کے نومسلموں نے نوٹ کیا ہے کہ ایفرو امریکی آبادیوں کے علاقوں میں اکثر شراب خانوں کے مالک یہودی ہیں۔

قرآن وسنت پر عمل کس طرح کیا جائے اور سرمایہ دارانہ نظام کے عظیم گڑھ ریاستہائے متحدہ امریکہ میں اسلامی انقلاب کس طرح برپا کیا جاتے؟ مظفر الدین صاحب اور ان کے دوستوں کو دَورِ جدید میں تحریکِ اسلامی کی سب سے عمدہ مثال جماعتِ اسلامی پاکستان میں نظر آئی اور بیسویں صدی عیسوی کے عظیم مفکرِ اسلام سید مودودی کی کتابوں کے انگریزی تراجم کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ گروپ اپنے لیے ایک واضح لائحہ عمل پا چکا ہے۔

اوّل اوّل مسجد الاُمّہ کا قیام ایفرو امریکی مسلمانوں کے باہمی تعاون سے عمل میں آیا۔ اور نومسلموں کو تحریکی جذبہ رکھنے والے دو عرب مسلمانوں نے اسلام کی بنیادی تعلیم دی۔ ان میں سے ایک جن کا نام قیس ہے عراق سے آئے ہوتے ہیں اور دوسرے، عدنان، فلسطینی ہیں۔ وضو کا طریقہ، اذان کیسے دی جاتے، نماز کیسے ادا کی جاتے؟ یہ سب اللہ کے ان نیک بندوں نے نومسلموں کو سکھایا۔ قیس مقامی یونیورسٹی میں کیمسٹری پڑھاتے ہیں لیکن دین سے اتنا گہرا لگاؤ ہے کہ زیادہ تر وقت مسجد ہی میں گزارتے ہیں۔ اخوان والا جوش و جذبہ عدنان اپنے ساتھ لاتے۔ اللہ کا فضل ہے کہ مسجد الاُمّہ پانچوں وقت نماز کے لیے کھلی رہتی ہے۔

۱۹۷۱ء کے شروع میں مسجد الاُمّہ سے دو ورقوں کی شکل میں روزمرہ کے مسائل پر اسلام کے نقطۂ نظر سے مختصر مضامین شائع ہونے شروع ہوتے۔ جولائی ۱۹۷۱ء سے "الاُمّہ" نامی رسالہ شائع ہونا شروع ہوا۔ اور پھر نومبر ۱۹۷۱ء سے ایک ماہانہ جریدہ نما اخبار "الاسلام" جاری ہوا۔ اور جنوری ۱۹۷۲ء میں نومسلموں کے اس گروپ نے تبلیغی جماعت سے بڑھ کر ایک تحریکی تنظیم کی شکل اختیار کر لی جس کا نام "جماعتِ اسلامی شمالی امریکہ" رکھا گیا۔ تبلیغی ڈھانچہ بھی مسجد کی شکل میں قائم ہے اور نئے مسلمانوں میں سے جو لوگ غیر معمولی

جذبے اور صلاحیت کا ثبوت دیتے ہیں اُنہیں جماعت میں شامل ہونے کا موقع دیا جاتا ہے۔ تحریک کے اثرات آہستہ آہستہ واشنگٹن اور اطراف کے علاقوں میں پھیل رہے ہیں۔ امریکہ کے دو دیگر شہروں میں بھی یہ کام ابتدائی مراحل سے گزر رہا ہے۔ شکاگو اور پٹس برگ میں نومسلموں کی دو تنظیمیں قائم ہوئی تھیں اور چند ماہ ہوتے وہ جماعت اسلامی شمالی امریکہ میں شامل ہو گئیں۔ ڈیٹرائیٹ کے شہر میں نومسلم تحریک سے وابستگی کا اظہار کر رہے ہیں لیکن ابھی وہ دین کی بنیادی تعلیم حاصل کر رہے ہیں اس لیے فی الحال انہیں جماعت میں شامل نہیں کیا گیا۔

جس ماحول سے یہ لوگ اسلام کی طرف کھنچے چلے آ رہے ہیں وہ کسی طرح بھی عرب کے زمانۂ جاہلیت سے کم فاسد نہیں ہے۔ لیکن ہر انسان میں نیکی کی ایک آرزو موجود ہوتی ہے اور اُسے اگر حق بات سُننے کا موقع مل جائے اور ساتھ ہی کچھ ہمت بھی ہو تو وہ ضرور سچائی کی طرف لپکتا ہے۔ جس ماحول میں امریکی عوام سانس لیتے ہیں اُس میں گناہ انسان کو ہر طرف سے گھیرے ہوتے ہیں اور گناہ کا احساس تقریباً مفقود ہے یا پھر غلاظت کے انبار تلے دبا ہوا ہے۔ اسلام کی یہ خصوصیت ہے کہ انسان کو حیات نو بخشتا ہے اور جوہر انسانیت کو بُرے سے بُرے حالات میں بھی اُجاگر کر دیتا ہے۔ مسجد الامہ میں جو لوگ مسلمان ہونے کے لیے آتے ہیں اُن میں سے اکثر کی حالت بہت خراب ہوتی ہے۔ انہیں پہلے یہ بتایا جاتا ہے کہ اپنے پُرانے طریقے مکمل طور پر چھوڑنے ہوں گے۔ اگر وہ کسی عورت کے ساتھ رہتے ہوں تو حکم دیا جاتا ہے کہ یا تو عورت کو فوراً چھوڑ دیں یا اُس سے شادی کریں۔ اگر شراب کی عادت ہو تو اسے چھوڑ دیں۔ پھر انہیں قرآن پاک، حدیث اور سیرت کے بارے میں پڑھنے اور مسجد میں اُن کو درس میں شامل ہونے کو کہا جاتا ہے۔ اُس کے بعد اگر وہ دین میں آگے بڑھتے نظر آئیں تو قرآن، حدیث اور سیرت کے ساتھ ساتھ درج ذیل کتابیں بغور پڑھنے اور انہیں اپنی فکر میں شامل کرنے کے لیے کہا جاتا ہے:

I. TOWARDS UNDERSTANDING ISLAM.
2. PROCESS OF ISLAMIC REVOLUTION.
3. ISLAMIC WAY OF LIFE.
4. ISLAMIC LAW AND CONSTITUTION.
6. COME LET US CHANGE THIS WORLD.

یہ پانچوں مولانا مودودی کی کتابوں کے انگریزی تراجم ہیں۔ ان کے علاوہ سید قطب شہیدؒ کی THIS RELIGION OF ISLAM اور محمد قطب کی ISLAM THE MISUNDERSTOOD RELIGION بھی نصاب میں شامل ہیں۔ حالاتِ حاضرہ کو سمجھنے کے لیے تین کتابیں پڑھنا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ مولانا مودودی کی ISLAM TODAY، چودھری غلام محمد کی MIDDLE EAST CRISIS اور مصباح الاسلام فاروقی کی JEWISH CONSPIRACY

جماعت اسلامی شمالی امریکہ" نے خود بھی کتابیں شائع کرنے کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ اول اشاعت ایک نومسلم یوسف عبدالنور کا کتابچہ "دعوتِ اسلام" THE ISLAMIC CALL تھی۔ اب جماعت نے بہت شان کے ساتھ مولانا مودودی کی تحریروں کا انتخاب COME, LET US CHANGE THIS WORLD شائع کیا ہے۔ امید ہے کہ اس کے اثرات دُور دُور تک پھیلیں گے۔

جو لوگ تحریک میں دلچسپی کا اظہار کرتے ہیں وہ کتابوں کا مطالعہ شروع کر دیتے ہیں اور مسجد میں آنے لگتے ہیں۔ پھر انہیں رکنیت کا فارم بھرنے کے لیے کہا جاتا ہے۔ یہ درخواست کئی ہفتے تک زیرِ غور رہتی ہے۔ ساتھ ہی امیدوار کو جماعت کے کاموں میں حصہ لینے کا موقع دیا جاتا ہے اور جماعت کا اخبار "الاسلام" بیچنے کے کام پر لگایا جاتا ہے۔ یہ اخبار اب ہر ماہ دس ہزار کی تعداد میں شائع ہوتا ہے اور اکثر جماعت کے امیدوار اسے سڑکوں پر اور بازاروں میں کھڑے ہو کر بیچتے ہیں۔ اس طرح چند ہفتوں تک جماعت کے کاموں میں غیر رسمی شمولیت سے امیدوار کو اندازہ ہو جاتا ہے کہ آیا وہ درحقیقت جماعت کے نصب العین کو حق سمجھتا ہے یا محض جذباتی لگاؤ کی وجہ سے امیدوارِ رکنیت بن گیا تھا۔

امیدوار سے جو عرضی بھروائی جاتی ہے اُس میں وہ درجِ ذیل اقرار کرتا ہے:

"میرے لیے یہ تحریک عین مقصدِ زندگی ہے۔ میرا مرنا اور جینا اِس کے لیے ہے۔ کوئی اس پر چلنے کے لیے تیار ہو یا نہ ہو بہر حال مجھے تو اس راہ پر چلنا اور اسی راہ میں جان دینا ہے۔ کوئی آگے نہ بڑھے گا تو میں بڑھوں گا۔ کوئی ساتھ نہ دیگا تو میں اکیلا چلوں گا۔ ساری دنیا متحد ہو کر مخالفت کرے گی تو مجھے تن تنہا اُس سے لڑنے میں بھی باک نہیں ہے۔"

مولانا مودودی کے یہ تاریخ ساز الفاظ تحریکِ اسلامی کی اسپرٹ کی ترجمانی کرتے ہیں اور شمالی

امریکہ کے مسلمان انہیں دیکھ کر سمجھ لیتے ہیں کہ مسلمان ہونا آسان نہیں اور اسلام ایک مسلسل جہاد کا نام ہے۔
"جماعت اسلامی شمالی امریکہ" کے امیر جناب مظفر الدین حمید کو پورا احساس ہے کہ جیسے جیسے تحریک آگے بڑھے گی مخالف قوتیں اسے ختم کرنے کی کوشش کریں گی۔ یہ جماعت کھل کر اسرائیل اور صیہونیت پر تنقید کرتی ہے اور عوام میں سے صیہونی نفوذ کو نکالنے کی کوشش کر رہی ہے۔
ساتھ ہی ایلیجاہ محمد کے BLACK MUSLIMS سے بھی خطرہ ہے۔ کیونکہ یہ "کالے مسلمان" جو در اصل مسلمان نہیں ہیں بلکہ ایک شخص فرد محمد کو خدا کا پیغمبر مانتے ہیں، امریکی حکومت کی طرف سے امداد یافتہ سمجھے جاتے ہیں اور ان کی موجودگی امریکہ میں اسلام کے رستے کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ عوام زیادہ تر BLACK MUSLIMS کے مذہب کو اسلام سمجھتے ہیں اور چونکہ یہ نسلی بنیادوں پر قائم ہے اس لیے گوری حکومت ان کے کام سے مطمئن ہے۔ کیونکہ اُس کے ذریعہ سے کسی گورے کا مسلمان ہو جانا ممکن نہیں ہے، بلکہ اُس کی بدولت گوروں میں اسلام سے شدید نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔ "جماعت اسلامی شمالی امریکہ" سائنسی انداز اور دلیل کے زور سے لوگوں کو محمد عربیؐ کے لائے ہوئے دین کی طرف بلا رہی ہے۔ "کالے مسلمانوں" میں ہتھیاروں کی فراوانی ہے اور وہ مخالفین پر حملہ آور ہونے سے نہیں چوکتے۔ اس لیے ڈر ہے کہ آج نہیں تو کل یہ جماعت پر مسلح حملہ کریں گے۔
اسی طرح افرو امریکی آبادی میں جو کمیونسٹ ہیں وہ بھی بندوق کی نالی پر ایمان رکھتے ہیں کہنے کو تو یہاں متحدہ جمہوریت ہے لیکن یہاں فاشسٹ اور کمیونسٹ دونوں قسم کے رجحانات موجود ہیں اور مخالفین کو تشدد کا نشانہ بنانے کی روایت بھی عام ہے۔ اسی لیے جماعت کے ارکان کو جذبۂ جہاد کا بہت خیال رہتا ہے اور اسی جذبے کو پوری طرح ابھارنے کے لیے "الجہاد فی الاسلام" کا قسط وار ترجمہ "الاسلام" میں شائع کیا جا رہا ہے۔ مکمل ہو جانے پر یہ ترجمہ کتابی شکل میں آجائے گا۔
سقوطِ مشرقی پاکستان کا مسجد الأمۃ سے تعلق رکھنے والے تمام مسلمانوں کو بہت رنج ہے لیکن ایک صاحب پر اتنا اثر ہوا کہ انہوں نے تحریک سے علیحدگی اختیار کر لی اور وجہ یہ بتائی کہ جب جماعت اسلامی پاکستان کو بچانے میں ناکام ہو گئی ہے تو ہم امریکہ میں کیونکر کامیاب ہو سکتے ہیں۔ لیکن امیر جماعت یوسف حمید اور دیگر رفقاء اس ردِ عمل کو بالکل غلط سمجھتے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ پاکستان میں جماعت اسلامی ناکام نہیں ہوئی بلکہ پاکستان کے عوام سیاسی طور پر ناتجربہ کار اور دینی حیثیت سے

بے علم ہونے کے باعث نا اہل لوگوں کے ہاتھوں میں اپنی قیادت دے کر بھٹک گئے ——— انہیں فخر ہے کہ مشرقی پاکستان میں جماعتِ اسلامی نے مسلح ہو کر ملک کا دفاع کیا اور جان پر کھیل کر ملک کو بچانے کی کوشش کی۔ ان سب کی دعا ہے کہ پاکستان کے عوام جلد از جلد مارِ آستین قسم کے لوگوں سے نمٹ لیں اور اسلامی نظام کی طرف اپنا سفر جاری رکھیں۔ ہمارے فلسطینی دوست عدنان جب مسجد الاُمّہ میں ملے تو سخت اضطراب کی حالت میں تھے۔ کہہ رہے تھے یقین نہیں آتا کہ کروڑہا مسلمانوں کے ملک میں ہندو دشمن اتنی آسانی سے کیسے داخل ہو گیا اور یہ کیا بات ہے کہ قادیانی کھلم کھلا مملکتِ خداداد میں دندناتے پھرتے ہیں اور کوئی ان میں خدا کا خوف ڈالنے والا نہیں ہے۔ میں نے انہیں بڑی مشکل سے یقین دلایا کہ پاکستانی قوم میں ابھی ایسے لوگ موجود ہیں جو اسے نئی زندگی بخش سکیں اور اس قابل بنا سکیں کہ وہ عزت کی زندگی گزار سکے۔

مسجد الاُمّہ کے پُر جوش مؤذن کی اذان مجھے کبھی نہ بھولے گی۔ امیر جماعت یوسف صاحب کا سنجیدہ چہرہ اور اسلامی داڑھی اور اُن کے ہاں گزارے ہوئے چند پاکیزہ دن یاد آتے ہیں تو دل سے دعائیں نکلتی ہیں کہ اللہ انہیں اور اُن کے رفقاء کو ثابت قدم رکھے اور انہیں تقویٰ کی نعمتوں سے مالا مال کرے۔

قوموں کے عروج و زوال ـــ انقلاباتِ عالم کے داخلی اور خارجی محرکات ـــ تہذیب و تمدن کی ترقی و انحطاط کے بارے میں مغربی مفکرین شپنگلر، ہیگل اور مارکس نے جو کچھ کہا ہے اس کی فکر انگیز تصریح اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اس کا تجزیہ و تنقید اس کے علاوہ اسلامی فلسفۂ تاریخ کی تشریح و توضیح

عبد الحمید صدیقی کی انگریزی کتاب

A PHILOSOPHICAL INTEPRETATION OF HISTORY

"تاریخ کی فلسفیانہ تعبیر" میں ملاحظہ فرمائیے قیمت دس روپے

ملنے کا پتہ: مکتبہ ترجمان القرآن، اچھرہ - لاہور (پاکستان)

اسلام میں تحریمِ اشیاء اور اس کی حکمت

از: شیخ یوسف القرضاوی

ترجمہ عبدالحمید صدیقی

تحریم مُردار اور اس کی حکمت آیاتِ قرآنی میں جن محرماتِ خورد و نوش کا ذکر کیا گیا ہے اُن میں سب سے پہلے مُردار ہے۔ مُردار سے مُراد وہ جانور اور پرندہ ہے جو اپنی طبعی موت مر جائے یعنی اُس کے مرنے میں انسان کے سعی و عمل کا کوئی دخل نہ ہو۔

ہو سکتا ہے کہ دورِ حاضر کے انسان کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ انسان پر مُردار کو حرام کرنے میں آخر کیا حکمت ہے اور وہ کیوں اُس سے اپنے کام و دہن کی تسکین نہیں کر سکتا؟ ہم اس سوال کا جواب یہ دیتے ہیں کہ اس "مُردار" کے حرام کرنے میں بہت سی حکمتیں پوشیدہ ہیں۔ جن میں سے چند ایک یہ ہیں:

۱۔ طبعِ سلیم اس سے اِبا کرتی ہے اور اُسے گندا اور ناپاک سمجھتی ہے اور سمجھ دار لوگ اسے کھانا توہین سمجھتے ہیں جو احترامِ آدمیت کے منافی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جملہ اہلِ کتاب اس کی حُرمت کے قائل ہیں اور وہ صرف ذبح شُدہ جانور ہی کھاتے ہیں اگرچہ ذبح کرنے کے طریقے مختلف ہیں۔

۲۔ جملہ دینی و دنیاوی اُمور میں مسلمان کو قصد و ارادہ کا عادی بنایا جائے۔ کسی چیز کا حصول یا کسی کام کا خاطر خواہ نتیجہ اُس کے لیے اسی وقت ممکن ہو جب پُوری نیت، ارادے اور کوشش سے اس کی طرف متوجہ ہو۔ ذبح جو کسی جانور کو مُردار کے حکم میں نہیں، اُس کا مطلب بھی یہی ہے کہ کھانے کی غرض سے کسی جانور کے رشتۂ روح و بدن کو منقطع کرنے کا ارادہ کیا جائے اور اللہ تعالیٰ کسی انسان کے لیے یہ پسند نہیں کرتا کہ وہ کوئی ایسی چیز کھائے جسے حاصل کرنے کا اُس نے کوئی ارادہ نہیں کیا اور جس کے بارے میں وہ بالکل غور و فکر نہ کرے جیسا کہ مُردار، مگر ذبیحہ یا شکار دونوں کے حصول میں ارادہ اور سعی و عمل کا دخل ہوتا ہے۔

۳۔ جو جانور از خود مر جائے تو ہو سکتا ہے کہ وہ کسی دیرینہ یا ہنگامی بیماری یا کسی زہریلی گھاس پھونس

کے کھانے سے مرا ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ شدتِ ضعف اور طبیعت کی کمزوری سے مر گیا ہو ان تمام صورتوں میں اس کا کھانا نقصان اور ضرر سے خالی نہیں ہو سکتا۔

۴۔ اللہ تعالیٰ مُردار کو ہم بنی نوعِ انسانی پر حرام کر کے جانوروں اور پرندوں کے لیے اپنی شانِ رحیمی کے تحت یہ موقع مہیا کرتا ہے کہ وہ مُردار کو اپنی غذا بنائیں کیونکہ وہ بھی جیسا کہ قرآن مجید میں آتا ہے ہماری طرح جماعتوں کی جماعتیں ہیں۔ یہ بات جنگلات اور اُن جگہوں میں صاف طور پر مشاہدہ کی جا سکتی ہے جہاں کسی جانور کا مُردار پوشیدہ نہیں رہ سکتا۔

۵۔ اگر کوئی انسان کسی جانور کو رکھنا چاہے تو وہ اسے اس طرح نہ چھوڑ دے کہ وہ کسی مرض یا کمزوری کا شکار ہو کر مر جائے بلکہ اس کے علاج و آرام میں عجلت سے کام لے۔

بہائے ہوتے خون کی تحریم ان حرام شدہ چیزوں میں سے دوسری چیز بہایا ہوا خون ہے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے تلی کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا "اسے کھاؤ"۔ لوگوں نے کہا "وہ تو خون ہے"۔ آپ نے جواب دیا "اللہ تعالیٰ نے تم پر بہائے ہوئے خون کو حرام کیا ہے"۔ اور اس کے حرام کیے جانے میں یہ راز ہے کہ وہ گندا ہوتا ہے اور نفاست پسند طبائع انسانی اس سے ابا کرتی ہیں۔ نیز ضرر رسانی کا اُس میں بھی مُردار ہی کی طرح احتمال ہے۔

زمانۂ جاہلیت میں اگر کسی شخص کو بھوک لگتی تھی تو وہ ہڈی یا اس طرح کی کوئی تیز چیز لے کر اپنے اونٹ یا جانور کو فصد لگاتا تھا پھر جو خون اُس سے نکلتا تھا اُسے جمع کر کے پی لیتا تھا۔ چونکہ اس فصد لگانے سے جانور کو تکلیف ہوتی ہے اور وہ کمزور ہو جاتا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے اسے حرام فرما دیا ہے۔

سؤر کا گوشت محرّمات میں سے تیسری چیز سؤر کا گوشت ہے۔ چونکہ سؤر کی پسندیدہ ترین غذا گندی اور پلید چیزیں ہوتی ہے اس لیے سلیم الطبع انسان اُسے ناپاک سمجھتے ہیں اور موجودہ طب نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ سؤر کے گوشت کا کھانا دنیا کے سارے علاقوں میں نقصان دہ ہے۔ اسی طرح سائنسی تجربات سے یہ بات بھی پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ اس کے گوشت کا کھانا ایک قسم کے مہلک کیڑے کے پیدا ہونے کا سبب بنتا ہے۔ اور کون جانتا ہے کہ کل سائنس ہم پر سؤر کے گوشت کی تحریم کے کن کن اسرار کا انکشاف کرے گی جنہیں ہم آج نہیں جانتے۔ اور سچ کہا ہے خداوندِ

ذوالجلال نے اپنے اس قول میں جو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے بیان کیا ہے کہ وَ یُحَرِّمُ عَلَیْہِمُ الْخَبٰٓئِثَ (اور اللہ تعالیٰ نے لوگوں پر ناپاک چیزوں کو حرام ٹھہرایا ہے)۔

بعض محققین یہ بھی کہتے ہیں: سؤر کا گوشت ہمیشہ کھاتے رہنے سے غیرت و حمیّت کا جذبہ کمزور پڑ جاتا ہے۔

غیر اللہ کے نام کا ذبیحہ | حرام شدہ چیزوں میں سے چوتھی چیز غیر اللہ کے نام کا ذبیحہ ہے، یعنی ایسا جانور جسے غیر اللہ (بُت وغیرہ) کے نام پر ذبح کیا گیا ہو۔ بُت پرستوں میں یہ رواج تھا کہ جب وہ کسی جانور کو ذبح کرتے تھے تو اُس پر اپنے بُتوں مثلاً لات و عزّیٰ وغیرہ کے نام لیتے تھے اس سے اُن کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ غیر اللہ کا تقرب حاصل کریں اور ربِّ عظیم کے نام کو چھوڑ کر غیروں کے ناموں سے اپنی عبودیت کو وابستہ کریں۔ غیر اللہ کے نام کے ذبیحے کو حرام کرنے کا سبب خالصتاً دینی ہے یعنی اس سے مقصود صرف یہ ہے کہ توحیدِ الٰہی کی حفاظت کی جائے اور عقاید کو پاک رکھا جائے اور شرک اور بُت پرستی کے سارے مظاہر کا ہر میدان میں مقابلہ کیا جائے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا فرما کر رُوئے زمین کی ہر چیز کو اس کے لیے مسخّر اور جانوروں کو اس کے تابع کر دیا ہے۔ اور اس کے لیے یہ بات جائز رکھی ہے کہ وہ اللہ کا نام لے کر ہر حلال جانور کو ذبح کر کے اس کے رشتۂ رُوح و بدن کو منقطع کر سکتا ہے۔ ذبح کے وقت اس پر اللہ کا نام لینے کا مطلب اس بات کا اعلان ہے کہ اس زندہ مخلوق کو اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کی رضا سے ذبح کیا گیا ہے لیکن اگر وہ جانور کو ذبح کرتے ہوئے اس پر کسی غیر اللہ کا نام لے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اُس نے اللہ کے حکم کو جھٹلایا اور خود کو اس بات کا مستحق ٹھیرایا کہ اس ذبح شدہ جانور کو کھانے سے محروم رہے۔

مُردار کی اور قسمیں | اگر اجمالی طور پر ذکر کیا جائے تو محرّمات صرف مذکورہ بالا چار ہی ہیں۔ مگر سُورۂ مائدہ کی ایک آیت میں مُردار کی اقسام کو ذرا تفصیل سے بیان کیا گیا ہے اور یُوں اُن کی تعداد دس ہو گئی ہے:

۵۔ اَلْمُنْخَنِقَۃُ: وہ جانور جو کسی وجہ سے گلا گھٹ کر مر گیا ہو۔

۶۔ اَلْمَوْقُوْذَۃُ: وہ جانور جسے ڈنڈے وغیرہ سے اس قدر پیٹا گیا ہو کہ وہ مر جائے۔

۷ - اَلْمُتَرَدِّیَۃُ : وہ جانور جو کسی اُونچی جگہ سے یا کنوئیں وغیرہ میں گر کر مر گیا ہو۔

۸ - اَلنَّطِیْحَۃُ : وہ جانور جسے کسی دوسرے جانور نے سینگ مارا ہو اور اس سے اُس کی موت واقع ہو گئی ہو۔

۹ - درندوں کا کھایا ہوا : وہ جانور جسے کسی دوسرے شکاری جانور نے کاٹ کھایا ہو اور اس سے وہ مر گیا ہو۔

مُردار کی ان پانچ مزید قسموں کا ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اِلَّا مَا ذَکَّیْتُمْ یعنی ان جانوروں میں سے جو جانور تمہیں اس حالت میں مل جائے کہ اس میں ابھی زندگی باقی ہو اور تم اُسے ذبح کر لو تو وہ تمہارے لیے حلال ہے۔ ایسے جانور کے حلال ہونے کے لیے یہی شرط کافی ہے کہ ذبح کیے جانے سے پہلے اس میں زندگی کی رمق ہو۔ چنانچہ حضرت علیؓ ابن ابی طالب سے روایت ہے کہ جب تم موقوذہ، متردیہ اور نطیحہ کو قابلِ ذبح پاؤ یعنی اس حالت میں کہ اس کے ہاتھ پاؤں میں حرکت موجود ہو تو اُسے ذبح کر کے کھا لو۔ ضحاک فرماتے ہیں کہ دورِ جاہلیت میں لوگ ان مرداروں کو کھا لیتے تھے مگر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لیے انہیں حرام کر دیا بجز اس کے کہ وہ انہیں زندہ پا کر ذبح کر لیں۔

ان اقسام کے حرام کیے جانے کی حکمت : مُردار کی مذکورہ بالا اقسام کو حرام کرنے میں اگرچہ یہ حکمت بھی ہے کہ ان میں بھی ضرر رسانی کا ویسا ہی احتمال ہے جیسا کہ عام مردار میں ہے مگر اس میں ایک اور حکمت بھی ہے کہ وہ حکیم و علیم ذات لوگوں کو یہ تعلیم دینا چاہتی ہے کہ وہ جانوروں کی دیکھ بھال اور نگہداشت میں پوری دلچسپی لیں اور وہ انہیں بالکل ہی نظر انداز نہ کر دیں کہ ان میں سے کوئی گلا گھٹ کر یا کسی اونچی جگہ سے گر کر ہلاک ہو جائیں۔ نیز وہ انہیں یونہی نہ چھوڑ دیں کہ آپس میں ٹکرا کر ایک دوسرے کو مار ڈالیں۔ اور یہ بھی بالکل جائز نہیں کہ کسی جانور کو اس قدر پیٹا جائے کہ وہ ڈنڈے وغیرہ کی چوٹ کے اثر سے مر جائے جیسا کہ بعض سنگدل گڈریے کرتے ہیں۔ وہ دو بیلوں یا دو مینڈھوں کو اکسا کر ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں یہاں تک کہ وہ دونوں ہلاک یا ادھ موئے ہو جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے علماء نے یہ کہا ہے کہ نطیحہ حرام ہے اگرچہ وہ سینگ لگنے ہی سے زخمی ہوا ہو اور خون اس جگہ سے نکلا ہو جہاں سے اُسے ذبح کیا جاتا ہے۔ میرے خیال

میں نطیحہ کے حرام کیے جانے کا مقصد یہ ہے کہ جانوروں کو ایک دوسرے سے لڑانے والوں کو اس بات کی سزا دی جائے کہ وہ دو جانوروں کو آپس میں لڑا کر اُن میں سے ایک یا دونوں کی موت کا سبب بنے۔

جہاں تک درندوں کے خورُدے کے حرام کیے جانے کا تعلق ہے تو اُس میں پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ انسانی عزّت و وقار سے فروتر ہے کہ وہ درندوں کا پس خوردہ کھائیں۔ دَورِ جاہلیت کے درندوں کے پس خوردہ شکار کھا لیتے تھے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے مومنوں کے لیے اسے حرام فرما دیا ہے۔

آستانوں کا ذبیحہ حرام کردہ چیزوں میں سے دسویں آستانوں کا ذبیحہ ہے۔ آستانوں سے مُراد وہ سب مقامات ہیں جن کو غیر اللہ کی نذر و نیاز چڑھانے کے لیے لوگوں نے مخصوص کر رکھا ہو خواہ وہاں کوئی پتھر یا لکڑی کی مورت ہو یا نہ ہو خانہ کعبہ کے ارد گرد دورِ جاہلیت کے لوگوں نے ایسے آستانے بنا رکھے تھے اور اپنے بتوں کا تقرب حاصل کرنے کے لیے وہاں جانوروں کو ذبح کیا کرتے تھے۔

آستانوں کا ذبیحہ بھی غیر اللہ کے نام کے ذبیحے کی قبیل سے ہے کیونکہ دونوں میں طاغوت[1] کی تعظیم و تکریم کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ مگر دونوں میں فرق یہ ہے کہ غیر اللہ کے نام کا ذبیحہ ہو سکتا ہے کہ کسی بُت کے نام پر آستانوں سے دُور کہیں ذبح کیا گیا ہو اور جو آستانوں پر ذبح کیا جائے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اُس پتھر یا لکڑی کی مورت پر یا اس کے نزدیک ذبح کیا جائے خواہ اُس پر غیر اللہ کا نام نہ لیا جائے چونکہ خانہ کعبہ کے ارد گرد بہت سے آستانے تھے اور یہ ہو سکتا تھا کہ کوئی شخص اس وہم میں مبتلا ہو جائے کہ ان آستانوں کی نذر و نیاز اور ذبیحوں کا مقصد بیت اللہ کی عظمت کو دوبالا کرنا ہے۔ اس لیے قرآن مجید نے نص صریح کے ذریعے آستانوں کے ذبیحوں کو حرام قرار دے کر اس وہم کے امکانات کو ختم کر دیا ہے۔

مچھلی اور ٹڈی مُردار نہیں شریعت نے مچھلیوں اور اس طرح کے دوسرے آبی جانوروں کو مردارِ حرام سے مستثنیٰ قرار دیا ہے چنانچہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سمندر کے پانی کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ وہ پاک ہے اور اس کا مُردار حلال ہے[2]۔ اور اللہ تعالیٰ

---

[1] اس سے مُراد شیطان اور ہر وہ شخصیت ہے جسے خدا کی حاکمیت کے مقابلے میں لا کھڑا کیا گیا ہو۔
[2] احمد و اصحاب سنن۔

سورۂ مائدہ میں فرماتا ہے احل لکم صید البحر وطعامہ (تمہارے لیے سمندر کا شکار اور اس کا کھانا حلال کر دیا گیا ہے)۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ صید البحر سے مراد وہ جانور ہے جو شکار کر کے حاصل کیا جائے اور طعامہ سے مراد وہ جانور ہے جسے تیر وغیرہ سے شکار کیا جائے۔ ابن عباسؓ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ طعامہ سے مراد سمندر کا مردار ہے۔

صحیحین میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک فوجی دستے کو کسی مہم پر روانہ کیا تو انہوں نے ایک بہت بڑی مچھلی کو سمندر کے باہر ایک جگہ مرہ پایا اور وہ اس میں سے گوشت کاٹ کر تقریباً بیس روز تک کھاتے رہے۔ پھر جب وہ مدینے واپس آئے تو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مچھلی کا سارا ماجرا سنایا۔ آپؐ نے فرمایا: "وہ رزق کھاؤ جسے اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے نکالا ہے۔ ہمیں بھی کھلاؤ اگر تمہارے پاس کچھ ہو۔ تو بعض صحابہؓ اس مچھلی کا گوشت آپؐ کی خدمت میں لائے تو آپؐ نے اُسے کھایا۔

ٹڈی کا حکم بھی سمندر کے مردار ہی کی طرح ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے مُردہ حالت میں کھانے کی اجازت دی ہے کیونکہ اسے ذبح کرنا ممکن نہیں ہے چنانچہ ابن ابی اوفیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سات ایسے غزوات میں گئے جن میں ہم نے اُن کے ساتھ ٹڈی کھائی[1]۔

مُردار کی کھال، ہڈی اور بالوں سے فائدہ اٹھانا مُردار کے حرام ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اُس کا کھانا حرام ہے مگر جہاں تک اُس کی کھال، سینگ، ہڈی یا بال وغیرہ کا تعلق ہے تو ان کے استعمال میں کوئی حرج نہیں بلکہ انہیں استعمال کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ وہ ایک ایسی دولت ہیں جس سے فائدہ حاصل کیا جا سکتا ہے اس لیے انہیں کر دینا جائز نہیں۔

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ام المومنین میمونہ رضی اللہ عنہا کی لونڈی کو ایک بکری صدقے میں ملی اور وہ مر گئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اُدھر سے گزر ہوا تو آپؐ نے فرمایا: "کیا تم اُس کی کھال کو کما کر اس سے فائدہ نہیں اُٹھاتے؟" انہوں نے کہا: "وہ تو مُردار ہے۔" آپؐ نے فرمایا: "حرام تو مُردار کا کھانا ہے[2]۔"

---

[1] و [2] ابن ماجہ کے سوا سب کتبِ حدیث میں یہ روایتیں موجود ہیں۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے مُردار کی کھال کو پاک کرنے کا طریقہ واضح فرما دیا ہے اور وہ ہے اُس کی دباغت۔ ایک حدیث میں ارشاد نبوی ہے کہ کھال کی دباغت ہی اُسے ذبح کرنا ہے[1] یعنی جس طرح بکری وغیرہ کے حلال ہونے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اُسے ذبح کیا جائے اسی طرح کھال کو پاک کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اُسے کما لیا جائے۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ کھال کی دباغت اس کی ناپاکی کو دُور کر دیتی ہے[2]

صحیح مسلم وغیرہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ کسی بھی کھال کی اگر دباغت کر لی جائے تو وہ پاک ہو جاتی ہے۔ اہلِ ظاہر، امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد ابو یوسفؒ اور امام شوکانی فرماتے ہیں کہ "کسی بھی کھال" کے الفاظ میں ہر کھال آ جاتی ہے خواہ وہ کتے اور سؤر کی کھال ہو۔

ام المومنین سودہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے۔ وہ فرماتی ہیں کہ ہماری ایک بکری مر گئی تو ہم نے اس کی کھال کو کما لیا پھر ہم اُس میں نبیذ بناتے رہے یہاں تک کہ وہ پرانا مشکیزہ بن گئی[3]

اشد ضرورت محرمات کے عام حکم سے مستثنیٰ ہے:

مذکورہ بالا تمام محرمات پر اختیاری حالت میں ہی عمل کیا جا سکتا ہے۔ مگر جہاں تک اضطراری حالت (اشد ضرورت کے وقت) کا تعلق ہے تو اُس کا ایک الگ حکم ہے۔ خداوند عالم فرماتا ہے۔

وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ إِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ إِلَيْهِ۔ (انعام: ۱۱۹)

جن چیزوں کا استعمال حالتِ اضطرار کے سوا دوسری تمام حالتوں میں اللہ نے حرام کر دیا ہے اُن کی تفصیل وہ تمہیں بتا چکا ہے۔

مُردار اور خون وغیرہ کی تحریم کا ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ (البقرہ: ۱۷۳)

ہاں جو شخص مجبوری کی حالت میں ہو اور وہ ان میں سے کوئی چیز کھا لے بغیر اس کے کہ وہ قانون شکنی کا ارادہ رکھتا ہو یا ضرورت کی حد سے تجاوز کرے تو اس پر کچھ گناہ نہیں۔ اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

---

[1] ابوداؤد و نسائی۔ [2] حاکم [3] بخاری وغیرہ

اور اشد ضرورت یا حالتِ اضطرار متفقہ طور پر خوراک کی ضرورت ہے۔ یعنی کوئی شخص صرف اُسی وقت حالتِ اضطرار میں سمجھا جائے گا جب اسے سخت بھوک لگی ہو[1] اور کھانے کے لیے اُسے حرام شدہ چیزوں کے سوا کچھ میسّر نہ آسکتا ہو۔ ایسے شخص کے لیے جائز ہے کہ وہ حرام شدہ چیز میں سے بقدرِ ضرورت کھا کر اپنے آپ کو ہلاکت سے بچالے۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ جب تک اُس شخص کو کوئی حلال چیز میسّر نہ آجائے وہ حرام چیز سیر ہو کر کھا بھی سکتا ہے اور اس میں سے زادِ راہ بھی لے سکتا ہے"۔ اور ان کے علاوہ دوسرے فقہاء اور ائمہ کہتے ہیں کہ حالتِ اضطرار میں گرفتار شخص حرام چیز میں سے صرف قوتِ لایموت ہی کے لیے کھا سکتا ہے اور غالباً اللہ تعالیٰ کے فرمان غیر باغ ولا عادٍ (بغیر اس کے کہ وہ قانون شکنی کا ارادہ رکھتا ہو یا ضرورت کی حد سے تجاوز کرے) سے ظاہر بھی یہی ہوتا ہے۔ بھوک کی وجہ سے حالتِ اضطرار کے بارے میں مندرجہ ذیل صریح نصِ قرآنی موجود ہے۔

فَمَنِ اضْطُرَّ فِي مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّإِثْمٍ فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ (مائدہ: ۳)

البتہ جو شخص بھوک سے مجبور ہو کر حرام شدہ چیزوں میں سے کوئی چیز کھالے بغیر اس کے کہ گناہ کی طرف اس کا میلان ہو تو بے شک اللہ معاف کرنے والا رحم فرمانے والا ہے۔

ضرورتِ دوا: اگر کسی بیماری سے شفایابی مذکورہ بالا محرمات میں سے کسی ایک کے کھانے پر ہی موقوف ہو تو ایسے موقع پر حرام شدہ چیز کے استعمال کے بارے میں فقہاء نے اختلاف کیا ہے۔ بعض فقہاء دوا کو غذا کی طرح اشد ضرورت نہیں مانتے اور مندرجہ ذیل حدیث بطورِ استدلال پیش کرتے ہیں۔ ارشادِ نبویؐ ہے:

إِنَّ اللهَ لَمْ يَجْعَلْ شِفَاءَكُمْ فِيمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ[2]

اللہ تعالیٰ نے کسی حرام شے میں تمہارے لیے شفا نہیں رکھی۔

اور بعض فقہاء اسے غذا کی طرح اشد ضرورت کا درجہ دیتے ہیں اور دوا اور غذا دونوں کو قیامِ زندگی کے لیے لازمی سمجھتے ہیں اور دوا کے طور پر محرمات کے استعمال کے جواز میں اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں کہ حضور نبی کریمؐ نے عبدالرحمٰن بن عوفؓ اور زبیر بن عوامؓ کو خارش کے عارضے کی وجہ سے ریشم پہننے کی اجازت دے

---

[1] بعض فقہاء کہتے ہیں کہ اُسے اسی بھوک کی حالت میں ایک دن اور رات گزر جائیں۔

[2] اس حدیث کو بخاری نے ابن مسعود کی روایت سے نقل کیا ہے۔

رکھی تھی حالانکہ عام حالات میں ریشم پہننا منع ہے اور اس کے پہننے پر سخت وعید سنائی گئی ہے۔

ہو سکتا ہے کہ یہ بات اسلام سے زیادہ قریب ہو جو اپنی جملہ قانون سازیوں اور احکام و ہدایات میں انسانی زندگی کی پوری پوری حفاظت کرتا ہے تاہم حرام شدہ چیز پر مشتمل کسی دوا کے کھانے میں جو رخصت دی گئی ہے وہ مندرجہ ذیل شرائط سے مشروط ہے۔

۱- ایسی دوا کے استعمال نہ کرنے سے واقعی انسانی صحت کے خطرے میں پڑ جانے کا اندیشہ ہو۔

۲- حلال چیزوں پر مشتمل کوئی ایسی دوا میسّر نہ آتی ہو جو حرام سے بے نیاز کر دے۔

۳- ایسی دوا کو کسی ایسے مسلمان طبیب نے تجویز کیا ہو جس کی ثقاہت، فنِ طبابت اور دین دونوں میں مسلّم ہو۔

ہم اپنے مشاہدے اور مستند اطبا اور ڈاکٹروں کی رپورٹوں کے پیشِ نظر یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ کوئی طبی ضرورت ایسی نہیں جسے پورا کرنے کے لیے لازماً مذکورۂ بالا محرمات میں سے کسی ایک کو بطورِ دوا استعمال کرنا پڑے۔ تاہم ہم احتیاطاً ایک مسلمان کے لیے اس اصول کو برقرار رکھتے ہیں کہ وہ اضطراری حالت میں کسی حرام چیز کو بطورِ دوا استعمال کر سکتا ہے۔ کیونکہ ممکن ہے کسی وقت وہ کسی ایسے مقام میں رہنے پر مجبور ہو جہاں سوائے ان محرمات کے کوئی شے ملتی ہی نہ ہو۔

جب معاشرے میں دفعِ ضرورت کا سامان موجود ہو تو کوئی فرد مضطر الحال نہیں ہو سکتا

حالتِ اضطرار کے لیے صرف یہی شرط کافی نہیں کہ کسی انسان کے پاس کوئی کھانا موجود ہی نہ ہو بلکہ جب تک کسی معاشرے کے افراد — خواہ وہ مسلمان ہو یا ذمی — کے اتنا فالتو کھانا ہو کہ جس سے کسی دوسرے انسان کی ضرورت پوری ہو سکتی ہو، یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ انسان حالتِ اضطرار میں گرفتار ہے اور وہ حرام چیزیں کھا سکتا ہے۔ کیونکہ اسلامی معاشرہ ایک جسدِ واحد یا سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح ہے جس کے سب حصے ایک دوسرے کی مضبوطی و طاقت کا باعث ہوتے ہیں۔

امام ابنِ حزم رحمۃ اللہ علیہ اجتماعی کفالت کے بارے میں اپنی مشہور کتاب "المحلّی" میں لکھتے ہیں:—

"کسی مجبور مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ مردار یا خنزیر کا گوشت کھائے درآنحالیکہ اس کے اپنے ہی معاشرے میں رہنے والے کسی دوسرے مسلمان یا ذمّی کے پاس خود اپنی ضرورت سے

سے زاید کھانا موجود ہو کیونکہ جس کے پاس کھانا موجود ہو اس کا فرض ہے کہ وہ بھوکے کو کھلائے۔ اگر صورتِ حال واقعی ایسی ہو تو وہ مسلمان مُردار یا سوٴر کا گوشت کھانے پر مجبور نہیں اور اس کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ کھانے کے حصول کے لیے لڑے۔ اگر وہ لڑتا ہوا مارا جائے تو اس کے قاتل کو قصاص دینا پڑیگا۔ اگر کھانا ہونے ہوئے دوسرے بھوکے مسلمان کو نہ دینے والا قتل ہو جائے تو اُسے خدا کا باغی کہا جائیگا اور وہ ہمیشہ کے لیے اللہ کی لعنت کا مستحق ہوگا۔ اللہ تعالیٰ سورۂ حجرات میں فرماتا ہے: فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِىْ تَبْغِىْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ (پس اگر ظلم کرے ان دونوں میں سے ایک دوسرے پر تو لڑو اُس سے جو زیادتی کرے حتیٰ کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف رجوع کر لے)، اور کسی حقدار کو حق رسی سے روکنے والا اپنے بھائی پر زیادتی کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مانعینِ زکوٰۃ سے جنگ کی تھی[1]

---

[1] المحلّٰی لابنِ حزم۔ ج ۶ ص ۱۵۹۔

معذرت

ہمیں افسوس کہ اِس پرچہ میں حاجی ایم۔ ترکستانی کے مضمون "اشتراکی رُوس میں مسلمان" کی دوسری قسط عدمِ گنجائش کے باعث شاملِ اشاعت نہیں ہو سکی جس کے لیے ہم قارئین سے معذرت خواہ ہیں۔ انشاء اللہ آئندہ شمارے میں اس کی اشاعت کا اہتمام کر دیا جائے گا۔

ایڈیٹر

مطبوعات

بائیبل سے قرآن تک حصہ دوم | تالیف مولانا رحمت اللہ کیرانوی مرحوم ترجمہ مولانا اکبر علی صاحب شرح و تحقیق مولانا محمد تقی عثمانی صاحب صفحات ۵۲۸ قیمت مجلد -/۱۵ روپے۔ ناشر مکتبہ دار العلوم کراچی

برصغیر میں جب انگریزوں کا عمل دخل شروع ہوا تو سیاسی غلبے کے ساتھ ہی عیسائی مشنریوں نے مسلمانوں میں عیسائیت کی تبلیغ زور شور سے شروع کر دی۔ مذہبی میدان میں عیسائیوں کو قدم پھیلاتے دیکھ کر اسلام کا درد رکھنے والے علمائے کرام نے عیسائیت کی حقیقت کو بے نقاب کرنا ضروری سمجھا۔ تاکہ مسلمانوں کو اس کے اثرات سے بچایا جا سکے۔ اس مقصد کے لیے حضرات علماء نے تحریر و تقریر اور بحث و مناظرہ کی ہر ممکن صورت اختیار فرمائی۔ مولانا رحمت اللہ کیرانوی مرحوم کی بلند پایہ تصنیف "اظہار الحق" بھی اسی سلسلہ کی ایک مضبوط کڑی ہے۔ بائبل سے قرآن تک اسی کتاب کا اردو ترجمہ ہے جو تین بڑی جلدوں پر پھیلا ہوا ہے۔ اس وقت ہمارے پیش نظر دوسری جلد یہ ہے۔ اس جلد کا آغاز دوسرے باب سے ہوتا ہے جس میں بائبل کی تحریفات کا ذکر ہے۔ تیسرے باب میں نسخ کا معنی و مفہوم اور اس کی اقسام مع شواہد و امثلہ بیان کی گئی ہیں۔ چوتھے باب میں عقیدۂ تثلیث کو عقل کی کسوٹی پر پرکھ کر واضح کیا گیا ہے کہ یہ ایک بے اصل عقیدہ ہے۔ پانچویں باب میں قرآنِ پاک کا کلامِ الٰہی ہونا، اعجازِ قرآن کے دلائل سے ثابت کیا گیا ہے۔ نیز قرآن پر عیسائیوں کے اعتراضات کا جواب دیا ہے اور ضمناً احادیث کی صحت کا ثبوت بھی پیش کیا ہے۔

"بائبل سے قرآن تک"، عیسائیت کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے نہایت مفید کتاب ہے ضرورت اس امر کی ہے کہ پندرہ سو صفحات پر مشتمل اس ضخیم کتاب کی ایک تلخیص شائع کر دی جائے تاکہ اس کا دائرۂ اثر وسیع تر ہو سکے۔

نشانِ حیدر | تالیف محمد حنیف شاہد صاحب۔ شائع کردہ: ٹیکنیکل پبلشرز، اردو بازار لاہور۔ قیمت آٹھ روپے صفحات ۲۵۲۔

زیرِ تبصرہ کتاب میں پاکستانی فوج کے اُن سات جیالوں کی زندگیوں کے حالات قلمبند کیے گئے ہیں جنہیں دفاعِ وطن کے لیے غیر معمولی جرأت اور بہادری کے کارنامے سرانجام دینے کی وجہ سے سب سے بڑا فوجی اعزاز نشانِ حیدر عطا کیا گیا۔ ان خوش نصیب جیالوں کے نام یہ ہیں: کیپٹن راجہ محمد سرور، میجر چودھری طفیل محمد، میجر راجہ عزیز بھٹی، پائیلٹ آفیسر راشد منہاس، میجر محمد اکرم، میجر شبیر شریف۔ سوار محمد حسین۔

فاضل مصنف نے بڑی محنت اور عرق ریزی کے ساتھ اس کتاب کے لیے مواد جمع کیا ہے اور اسے بڑے سلیقے کے ساتھ ترتیب دے کر جرأت، استقامت اور ایثار کے واقعات کا ایک نہایت اچھا مرقع تیار کیا ہے۔

اس کتاب کے مطالعہ کے بعد جو چیز تبصرہ نگار کے لیے خاص طور پر موجبِ اطمینان ہے وہ ان جیالوں کی اسلام سے وابستگی ہے۔ خصوصاً کیپٹن راجہ محمد سرور جسے عام طور پر اُس کے عزیز و اقارب سخی سرور کے نام سے یاد کرتے تھے، وہ تو اسلام کے دلسوز فدائی نظر آتے ہیں۔

شروع میں چیف آف دی سٹاف جنرل ٹکا خان کا ایمان افروز پیغام بھی درج ہے۔ کتاب میں بعض مقامات پر زبان اور طباعت کی اغلاط موجود ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ فاضل مصنف دوسرے ایڈیشن میں ان کی تصحیح کا التزام کر دیں گے۔

معیارِ طباعت و کتابت گوارا ہے۔

صحیح مُسلم | انگریزی ترجمہ و تشریح: عبدالحمید صدیقی۔ ناشر شیخ محمد اشرف، کشمیری بازار۔ لاہور۔

زیرِ تبصرہ کتاب، جس پر تفصیلی تبصرہ پہلے ترجمان القرآن میں شائع ہو چکا ہے، کا پانچواں پارہ چھپ کر بازار میں آگیا ہے۔ یہ پارہ کتاب الصلوٰۃ کے پہلے حصے پر مشتمل ہے۔ ناشر نے پانچوں پاروں کی ایک الگ جلد بھی تیار کر دی ہے۔ ایک پارے کی قیمت آٹھ روپے اور پانچوں پاروں کی ایک جلد کی قیمت ۴۵ روپے ہے۔

(بقیہ اشارات)

میں بعض نمایاں تبدیلیاں معرضِ وجود میں آئیں مگر قریب قریب سارے حکمرانوں نے مسلم معاشرے کے اجتماعی تصورات کی حفاظت میں اپنی طرف سے کوئی کمی نہ آنے دی اور اس کی نظریاتی سرحدوں کی پوری جرأت کے ساتھ پاسبانی کی اور کسی دشمنِ دین کو ان پر حملہ آور ہونے کا موقع نہ دیا۔ جہاں تک امورِ مملکت میں اختلافِ رائے کا تعلق ہے۔ اس معاملے میں البتہ بعض حکمرانوں نے اس فراخدلی کا ثبوت نہ دیا جس کا اسلام تقاضا کرتا ہے۔ لیکن تاریخ کے اوراق اس حقیقت کے شاہد ہیں کہ مسلم سلاطین کی عظیم اکثریت تنقید کو ٹھنڈے پیٹوں برداشت کرتی رہی اور بہت کم ایسے مواقع آئے جن پر محض اختلافِ رائے کی وجہ سے کسی شخص کو جان کے لالے پڑے ہوں۔

اسلامی ریاست کے دائرے سے باہر نکل کر جب ہم دورِ جدید کی غیر مسلم ریاستوں پر غور کرتے ہیں تو اُن میں نظریات کے وسیع اختلاف کے باوجود ایک چیز قدرِ مشترک کے طور پر پاتے ہیں کہ یہ تمام ریاستیں اپنے اساسی تصورات کی پوری طرح محافظت کرتی ہیں۔ انگلستان اور فرانس کے اندر اختلافِ رائے کی جس قدر آزادی ہے اُسے پوری دنیا جانتی ہے لیکن وہاں کی بسنے والی قوموں نے کبھی یہ گوارا نہیں کیا کہ کوئی ان ریاستوں کی نظریاتی اساس کو کسی قسم کا نقصان پہنچائے۔ نظریاتی اساس تو خیر بڑی بات ہے، خود ان ریاستوں کے مفاد کے خلاف کسی فرد یا گروہ کو کوئی اقدام نہیں کرنے دیا جاتا اور اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو اسے روک دیا جاتا ہے مگر جہاں تک امورِ مملکت کا تعلق ہے ان میں اختلاف کی پوری گنجائش ہوتی ہے اور کسی فرد یا گروہ کو محض رائے کے اختلاف کی وجہ سے گردن زدنی نہیں سمجھا جاتا۔

اشتراکی ریاستیں بھی اساسی تصورات کے تحفظ کو اولیت کا درجہ دیتی ہیں کیونکہ اگر ان کا تحفظ نہ کیا جائے تو اس جابرانہ نظام کا وجود ہی قائم نہیں رہ سکتا۔ انہیں ہر وقت اس بات کا کھٹکا لگا رہتا ہے کہ اگر انہوں نے اس معاملے میں ذرا سا تغافل برتا تو یہ غیر فطری نظام فوراً درہم برہم ہو جائے گا

اس لیے اشتراکیت کے علمبردار ریاست کی نظریاتی بنیاد کے استحکام کے لیے فکر مند رہتے ہیں اور اس معاملے میں کسی فرد یا گروہ کی معمولی سی جسارت برداشت نہیں کرتے۔ چونکہ اس مزاج کا نظام انسانی فطرت سے مغائرت رکھتا ہے اس لیے جہاں جہاں یہ نظام قائم ہے وہاں عوام کو رائے کی قطعاً آزادی حاصل نہیں ہوتی اور وہ حکومت کی پالیسی پر کوئی تنقید نہیں کر سکتے۔ حکمران ہمیشہ اس خوف سے لرزاں رہتے ہیں کہ اگر عوام کی زبانوں پر سے پہرے اٹھا دیئے گئے اور انہیں لب کشائی کی جرأت ہوئی تو ان کے گھٹے ہوئے جذبات اس شدت کے ساتھ لاوا بن کر باہر نکلیں گے کہ اشتراکیت کا پورا ڈھانچہ پیوندِ خاک ہو جائے گا۔ انسان یوں بھی جذبات کی گھٹن کو دیر تک برداشت نہیں کر سکتا لیکن خصوصاً ایسی گھٹن جو اس کے اندر اپنی فطرت سے بغاوت کی وجہ سے پیدا ہوئی ہو اُسے اگر ایک مرتبہ اظہار کا راستہ مل جائے تو اس سے خوفناک قسم کے زلزلے پیدا ہوتے ہیں۔ اس لیے اشتراکیت اپنے مزاج کی وجہ سے امورِ مملکت کو چلانے کے لیے فسطائی ہتھکنڈوں کو اپنانے پر اپنے آپ کو مجبور پاتی ہے۔

پاکستان، بہت سے مسلم ممالک اور دَورِ جدید کے بعض غیر ترقی یافتہ ممالک میں صورت حال مندرجہ بالا سب صورتوں سے یکسر مختلف نظر آتی ہے۔ بعض لوگ یہ کہکر اس کی سنگینی کو نظر انداز کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ چونکہ یہ سارے ممالک تجرباتی مراحل سے گزر رہے ہیں، اس لیے ان کے اندر نظریاتی اساس کی اہمیت کا واضح شعور پیدا نہیں ہو سکا۔ مگر یہ حالات کا نہایت ہی سطحی مطالعہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی قوم کی نظریاتی اساس اس کے لیے وہی حیثیت رکھتی ہے جو ایک درخت کی جڑ کے لیے ہوتی ہے۔ اگر جڑ مضبوط ہو تو درخت کا تنا اور شاخیں بھی مضبوط ہوتی ہیں اور وہ طوفانوں کا پوری قوت سے مقابلہ کر سکتا ہے۔ لیکن اگر جڑ کمزور ہو تو اسی تناسب سے درخت کا پورا وجود کمزور ہوتا ہے اور طوفان تو کیا ہواؤں کے معمولی تھپیڑے اُسے اکھاڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ اس لیے جو قوم بھی سنجیدگی کے ساتھ تعمیرِ نو کا عزم لیکر اٹھتی ہے وہ فروعات میں اُلجھنے کے بجائے سب سے زیادہ توجہ اپنی نظریاتی اساس کو مضبوط بنانے کی طرف دیتی ہے۔ کیونکہ اسی پر اس کی اجتماعی زندگی کا قصر تعمیر ہوتا ہے۔ اس نظریاتی اساس کی بدولت اس قوم کے اندر فکر و احساس کی ہم آہنگی اور

اپنی سلاحیتوں کو تعمیر و ترقی کی راہ پر لگانے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ وہ زندگی کے دوسرے معاملات میں تو اختلاف گوارا کر لیتی ہے لیکن اس اساس کے معاملے میں کوئی اختلاف برداشت نہیں کر سکتی۔ کیونکہ اس کے حفظ و بقا ہی میں اس کی زندگی کی ترقی کا راز مضمر ہوتا ہے۔ اگر اجتماعی زندگی کا نقشہ اس کے برعکس کوئی دوسری صورت پیش کرے تو یہ اس قوم کے لیے بے حد تشویشناک ہوتا ہے۔

دوسرے ممالک کو تو فی الحال جانے دیجیے۔ صرف پاکستان کے حالات کا جائزہ لیکر دیکھیے کہ کیا ہماری نظریاتی اساس کے بارے ہمارا طرز عمل تعمیری ہے؟ ہم یہ بات بڑے دکھ کے ساتھ کہتے ہیں کہ ہم دنیا کی اُن بدنصیب قوموں میں سے ایک ایسی بدنصیب قوم ہیں جسے نظریاتی اساس کے تحفظ کی قطعاً کوئی فکر دامنگیر نہیں بلکہ ہم خود اپنے ہاتھوں سے اسے مسمار کرنے کے درپے ہیں۔ ہماری اس تخریب پسندانہ روش کے نتائج بھی کھل کر ہمارے سامنے آ رہے ہیں کہ ہمارے ہاں فکری انتشار کا ایک خوفناک طوفان اُمڈتا آ رہا ہے جس سے ہماری اقدارِ حیات اور ہماری روایات کو شدید نقصان پہنچا ہے۔ ہمارے وہ امتیازی اوصاف جن کی بنیاد پر ہم چند برس پہلے پوری دنیا سے اپنا الگ قومی وجود تسلیم کروانے میں کامیاب ہوئے تھے وہ بڑی سرعت کے ساتھ مٹتے جا رہے ہیں۔ ہمیں زندگی کے ہر میدان میں ناکامیوں اور محرومیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ ہماری حیثیت اس بے لنگر جہاز کی سی ہو گئی ہے جسے بین الاقوامی دریا کی لہروں کی طرح جس طرف چاہتا ہے بہا کر لے جاتا ہے۔

اس جذبہ کے ساتھ ہماری اجتماعی زندگی کا دوسرا بڑا المیہ یہ ہے کہ جن معاملات میں ہماری قوم کو اظہارِ رائے کی آزادی درکار ہے تاکہ اس کے بہی خواہ اس کے گرد منڈلاتے ہوئے خطرات کی نشاندہی کر کے اس سے نبرد آزما ہونے کے لیے اُسے تیار کر سکیں ان میں قطعاً اس کی کوئی گنجائش نہیں رکھی گئی۔ برسرِ اقتدار طبقے کے بارے میں عوام کے ذہنوں میں یہ تاثر قائم کیا گیا ہے کہ ان کی ہر بات صحیح اور ان کا ہر فعل حق و صداقت پر مبنی ہے، اور جو لوگ ان سے اختلاف کرتے ہیں۔ وہ ملک و ملت کے دشمن ہیں۔ اس فسطائی طرزِ عمل کا نتیجہ یہ ہے کہ پاکستان کی نظریاتی اساس کو تباہ کرنے

والوں کے ہاتھ میں ایک ایسا حربہ آگیا ہے جسے استعمال کرنے سے وہ اپنے اس مذموم کام کو بلاخوف و خطر سرانجام دینے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ اور وہ حربہ یہ ہے کہ یہ تخریب پسند عناصر جھوٹ، دجل و فریب اور اسی قسم کے مختلف حیلوں، بہانوں سے اقتدار کی صفوں میں گھس کر یا اس کی پناہ لے کر سب سے پہلے حکومت کی پشت پناہی حاصل کرتے ہیں۔ اور پھر اس تحفظ سے فائدہ اٹھا کر نظریاتی بنیاد کو بڑے اطمینانِ خاطر کے ساتھ حکومت کے وسائل کی مدد سے برباد کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ حکومت کا مزاج جس قدر آمرانہ ہو اُس میں اس عیار طبقے کا دخیل ہونا اتنا ہی سہل اور آسان ہوتا ہے جس ملک میں آزادیٔ رائے ہو اس میں حکومتیں اپنے تعمیری کاموں کے بل بوتے پر عوامی تائید حاصل کرتی ہیں لیکن جہاں حکومت کا نہج آمرانہ ہو اور حکومت فسطائی ہتھکنڈوں کے استعمال سے عوام کی گردنوں پر مسلط ہو، وہاں جو فرد یا گروہ بھی برسرِ اقتدار طبقے کی مدح سرائی پر آمادہ ہو اس کی پذیرائی کے نہایت اچھے سامان پیدا ہو جاتے ہیں۔ پرانے زمانوں میں عادل و منصف اور رعایا کے بہی خواہ حکمران عوام کی فلاح و بہبود کا خیال رکھ کر تسکینِ خاطر حاصل کیا کرتے تھے۔ انہیں اپنی مدح میں قصیدہ سننے کی کبھی خواہش نہ پیدا ہوتی تھی لیکن جو حکمران ظالم اور مستبد اور رعایا کے معاملے میں اپنے فرائض سے غافل ہوتے تھے انہیں اس بات کی شدت سے ضرورت محسوس ہوتی تھی کہ پیشہ ور قصیدہ خوانوں کو اپنے ارد گرد جمع کر کے ان سے قصیدہ خوانی کروائیں تاکہ ضمیر کی خلش کی وجہ سے انہیں جو ذہنی اذیت ہو رہی ہے اس کا وقتی طور پر تدارک کیا جا سکے۔

حکمرانوں کے نام اور ان کے القابات اگرچہ اب بدل گئے ہیں۔ بادشاہوں کی جگہ اب "عوامی قائدین" اور "عوامی رہنماؤں" نے لے لی ہے۔ مگر مزاج میں کوئی خاص تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔ عدل و انصاف کے علمبردار اور انسانیت کے حقیقی خیر خواہ قائدین کے لیے یہ بات بذاتِ خود روحانی اور ذہنی سکون کا باعث ہوتی ہے کہ وہ حق و صداقت کی راہ پر گامزن ہیں اس لیے وہ کسی فرد یا گروہ کی ثناخوانی سے بہکنے نہیں پاتے۔ وہ جس بات کو صحیح سمجھتے ہیں اسے پورے خلوص کے ساتھ کرتے ہیں۔ خواہ لوگ ان کی مدح سرائی کریں یا انہیں گالیاں دیں۔ انہیں نہ تو پیشہ ور ثناخوانوں کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور نہ ایسے غیر مخلص حامیوں کی جن کی وفاداریاں دنیوی مفادات کے ساتھ تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن جن لوگوں کا مطمح نظر محض اقتدار ہو اور اس کے حصول اور پھر اس پر طویل مدت تک قابض رہنے کے لیے وہ ہر قسم کے جائز و ناجائز حربے استعمال کرنے کے لیے تیار ہوں انہیں قصیدہ خوانوں اور زندہ باد کے نعرے لگانے والوں

کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے جب بھی کوئی قصیدہ خواں یا نعرہ باز ان کی طرف رجوع کرتا ہے تو یہ لپک کر اس کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ اور وہ نہایت قلیل مدت میں ان کا منظورِ نظر بن کر ان کے مزاج میں دخیل ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ جو بھی کرے اس پر کوئی گرفت نہیں کی جا سکتی ہے کیونکہ اقتدار کے تحفظ میں آجانے کے بعد وہ نہ صرف احتساب سے محفوظ ہو جاتا ہے بلکہ اس کے معصوم ہونے پر بھی مہر تصدیق ثبت ہو جاتی ہے اور جو شخص اس کے کسی کام پر اعتراض کرے وہ رجعت پسند، عوامی مفادات کا دشمن اور ملک و ملت کا بدخواہ قرار پاتا ہے اور اسے راستے سے ہٹانے کی پوری کوشش کی جاتی ہے۔

اسلام کے نامور مجاہد سیّد قطب شہید علیہ الرحمتہ کی

ایمان افروز اور فکر انگیز کتاب

"المستقبل لہٰذا الدین"

کا اردو ترجمہ

اسلام کا روشن مستقبل

از

عبد الحمید صدیقی

کتابت بہترین۔ طباعت دیدہ زیب۔ سرورق سہ رنگا خوبصورت۔ کاغذ آفسٹ پیپر۔ قیمت چار روپے۔

ادارہ ترجمان القرآن۔ اچھرہ، لاہور

ہماری تازہ ترین کُتب

حقیقتِ عبُودیت

(افادات علامہ ابن تیمیہؒ)

مترجم:- مولانا صدرالدین اصلاحی۔

- عبادت کی حقیقت اور اس کا صحیح مفہوم۔
- عبادت کے غلط تصورات اور ان کے اثرات
- قرآن مجید کی دعوت سمجھنے کے لیے ایک اہم کتاب
- علامہ ابن تیمیہؒ کے تبحر علمی کی آئینہ دار
- قیمت ۲/۷۵ روپے

معرُوف و مُنکر

تالیف:- جلال الدین انصر عمری

- اُمتِ مسلمہ کا مقصدِ وجود اور اس کے فرائض۔
- فریضۂ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی اہمیت۔
- اس فریضہ کو ادا کرنے کے طریقے۔
- موضوع پر عالمانہ اور تحقیقی کتاب۔
- قیمت ۹/۰۰ روپے

تعلیمات

مولانا
سید ابوالاعلیٰ مودودی

- ہمارا مقصدِ تعلیم کیا ہونا چاہیے؟
- ہمارے تعلیمی نظام کے نقائص؟
- ہمارا تعلیمی نظام اور نصاب کیا ہونا چاہیے۔
- ان اہم موضوعات پر مولانا مودودی کے فکر انگیز مقالات۔
- طلباء، پروفیسروں، اساتذہ اور تعلیمی اداروں کے لیے ایک ناگزیر کتاب۔

قیمت صرف ۵ روپے

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ - ۱۳، ای شاہ عالم مارکیٹ لاہور۔

ضروری اعلان

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تفسیر تفہیم القرآن جلد پنجم کے علاوہ پہلی چاروں جلدیں بھی ہمارے درجِ ذیل ایجنٹ حضرات سے دستیاب ہو سکتی ہیں۔

۱- فیروز سنز لمیٹڈ، دی مال لاہور

۲- سید مسعود علی رضوی مکان نمبر ۱۰۶۹ بلاک نمبر ۱۴ فیڈرل بی ایریا۔ رضوان آباد، کراچی نمبر ۳۰

۳- شیخ شوکت علی اینڈ سنز پبلشرز بک سیلرز اینڈ سٹیشنرز، محمد علی جناح روڈ، کراچی

۴- میسرز تاج کمپنی لمیٹڈ، بندر روڈ، کراچی

۵- نورسی پبلکیشنز، لیاقت آباد۔ کراچی

۶- میسرز یونائیٹڈ بک سیلرز اینڈ سٹیشنرز، اردو بازار کراچی

۷- شیخ سنز، اُردو منزل، اردو بازار کراچی

۸- پنجاب نیوز ایجنسی، اردو بازار، کراچی

۹- شبیر خان تاجر کتب، اڈرام ریڈیو پاکستان چوک کراچی

۱۰- مکتبہ تعمیر افکار اسلامی، حکیم ابن سینا روڈ، ناظم آباد کراچی

۱۱- مدینہ پبلشنگ کمپنی، بندر روڈ، کراچی

۱۲- مکتبہ اسحاقیہ جونا مارکیٹ پھول چوک کراچی نمبر ۲

۱۳- ادارہ امتیاز، صدر بازار کمالیہ ضلع لائل پور زون ۵

۱۴- غلام رحمانی پیرپراچہ ضیا بک ڈپو بازار شہیداں ہوتی مردان

۱۵- محمد یونس ورلڈ بک سٹال بک سیلرز اینڈ سٹیشنرز بنک روڈ، راولپنڈی کینٹ

۱۶- خان زمان خان اینڈ کمپنی غلہ منڈی سرگودھا

۱۷- مکتبہ اسلامی ریلوے روڈ صادق آباد ضلع رحیم یار خان

۱۸- شیخ سعید احمد خاکسار مارکیٹ فاروق جنرل سٹور ڈیرہ غازی خان

۲۰- رہنما پبلیکیشنز، واس روڈ، سکھر

۱۹- عجائب سٹور اسٹیشنرز بک سیلرز، فریئر روڈ، سکھر

۲۱- مکتبہ تعمیر ملت، ڈہرکی ضلع سکھر

۲۲- میسرز عزیز اینڈ سنز، شاہی بازار، لاڑکانہ

۲۳- مکتبہ اسلامی، کورٹ روڈ، حیدرآباد، سندھ

۲۴- محمد مصاحب علی، امیر جماعت اسلامی نواب شاہ

۲۵- مکتبہ اسلامی معرفت دفتر جماعت اسلامی جیکب آباد

۲۶- رحمان نیوز ایجنسی شارع فاطمہ جناح، کوئٹہ

۲۷- عزیزیہ کتب خانہ چوک صرافہ بازار، ڈیرہ اسمٰعیل خان

۲۸- ملت بک ڈپو، ریلوے روڈ، رحیم یار خان

۲۹- ضیاء بک ڈیلرز دا الہلال بک ڈپو چمن بازار ہارون آباد

۳۰- مکتبہ احیائے ملت، کپ بازار، ملتان

۳۱- میاں محمد شفیع صاحب آئرن مرچنٹ جناح چوک میاں چنوں، ضلع ملتان

۳۲- مکتبہ افکار اسلامی، بازار نواٹراں- راولپنڈی

۳۳- عبدالعزیز دکان نمبر ۵ -۲۱- ایریا مارکیٹ پی- او- ایف، واہ کینٹ

۳۴- ضیا بک ڈپو، بازار شہیداں ہوتی مردان

۳۵- شوکت کریانہ سٹور، مانسہرہ، ہزارہ

۳۶- عبدالرحمٰن شاہ خطیب جامع مسجد غزنی خیلاں بنوں شہر

۳۷- عبدالقدوس قیم جماعت صوبہ سرحد- نیا دروازہ پشاور